اندر گھستے ہی سفید ساڑھی والی کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور آہستہ سے بولی "معاف کیجئے، ہم غلط جگہ آ گئے شاید۔ یہ"

اختر نے آنکھیں ملتے ہوئے اور بھی آہستگی سے کہا "یہ کمرہ نمبر نو ہے شاید"

"نو نمبر کمرہ؟" صوفیہ نے اپنے آپ سے کہتے ہوئے پوچھا "معاف کیجئے! میں نمبر میں جانا تھا۔ مجھے تو"

اختر نے اپنے ریشمی نائٹ گاؤن کی ڈوریاں باندھتے ہوئے کہا "آپ بھی میری طرح اس ہوٹل میں نووارد ہی لگتی ہیں"

"نووارد؟" لمبی لمبی سیاہ آنکھوں والی نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ شاید آپ بھی آج ہی آئی ہیں"

لڑکی نے پیچھے ہٹتے ہوئے دروازے کی ناب پر ہاتھ رکھ لیا۔ اور مسکرا کر بولی "جی ہاں مجھے یہاں ٹھہرے تین دن ہو چکے ہیں۔ لیکن کیا کروں سب دروازے ایک سے ہیں، ساری منزلیں ایک سی ہیں۔ ہر بار اپنا کمرہ بھول جاتا ہے"

"کاش آپ یہ غلطی بار بار کریں" اختر نے مہذب انداز میں فلرٹ کرتے ہوئے کہا۔

سفید ساڑھی والی کی آنکھیں یک دم سکڑ گئیں۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا۔ اور دروازے کی درز کھلنے لگی۔

لڑکی کی خفگی دیکھ کر جلدی سے اختر نے خفیف ہو کر کہا۔ NO OFFENSEMENT بخدا!

لڑکی خاموش رہی۔ اس کے کندھے پر لمبی سیاہ چوٹی موٹے سے سانپ کی طرح لٹک رہی تھی۔ آہستہ سے گردن کا جھٹکا ملا تو یہ لمبا سانپ پھسل کر سامنے سینے پر گر گیا۔ بغیر موباف کے بال پلّو کے برابر ہو گئے۔ لڑکی نے دروازہ کھولا اور یوں باہر چلی گئی۔ جیسے کبھی آئی ہی نہ تھی۔

اختر نے کندھا جھٹک کر اپنے آپ سے کہا۔ "FALSE MODESTY ایسی ہزاروں لڑکیاں اپنے شہر لہور میں بستی ہیں۔"

دروازے پر پھر ہلکی سی دستک ہوئی اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر لمبی سیاہ آنکھوں والی کا سر اور تھوڑا سا کندھا اختر کو نظر آیا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

دروازے میں کھڑے ہو کر اس نے کہا "شاید آپ کے ہاں لڑکیوں سے بات کرنے کا یہی رواج ہے۔"

اختر خاموش رہا۔

"اگر ایسے ہے تو معاف کیجئے گا۔ میں ناراض ہو گئی۔ دراصل میں یہاں کے کسٹمز کی ابھی عادی نہیں ہوئی۔"

ایک بار پھر دروازہ بند ہو گیا۔

اختر نے لمبی انگڑائی لی۔ اور مسکرا کر بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ شام آ رہی تھی۔ اور کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ اس نے سفر کی کسلمندی دور کرنے کے لئے پہلے تو نہانے کا ارادہ کیا اور پھر تکیے پر سر رکھ کر سگرٹ جلا لیا۔

کراچی اس کے لئے کوئی نیا شہر نہ تھا۔ یہ ہوٹل بلکہ یہ کمرہ اس کے استعمال میں بار بار رہ چکا تھا۔ لیکن اس بار جیسے اُسے اپنے قیام سے ذہنی فرار کی توقع تھی۔ وہ لاہور سے اسی لئے بھاگا تھا کہ کراچی پہنچ کر خوب سوئے گا۔ بغیر شیو کئے باہر نکلے گا اور پندرہ روزہ قیام کو ان چھٹیوں کے مشابہ کر دے گا۔ جو کالج میں امتحانوں کے



بعد آیا کرتی تھیں۔ لاہور میں اس کی زندگی بور ہونے کی حد تک آرام دہ تھی۔ اور یہ آرام اُسے اتنا عزیز ہو چکا تھا کہ اب اس کے بغیر اسے اپنی زندگی کا تصور بھی ناقابل برداشت نظر آتا تھا۔

اختر نے لمبا سانس لے کر سوچا۔ اگر چچا اس دنیا میں نہ ہوتے! اگر چچا کی لڑکی اس دنیا میں سانس نہ لیتی۔ تو میرا مستقبل کتنا بھیانک اور تکلیف دہ ہوتا۔ ساری زندگی کلرکی میں گزر جاتی۔ بڑھاپے میں کہیں جا کر سپرنٹنڈنٹ ہو جاتا اور جب قوائے مضمحل میں تاب محنت نہ رہتی۔ تو سو سوا سو پر ریٹائر ہو کر گھر والوں پر سوار ہو جاتا۔ ایسی زندگی کے تصور سے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور قیمتی سگرٹ کا مزہ کسیلا ہو کر حلق کو چھبنے لگا۔

اچانک اختر کو احساس ہوا کسی نے اس کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی یہ دستک نہایت ہلکی تھی۔ کنول کے پھولوں پر ننگے پیر چلنے کی چاپ........ اختر ہڑبڑا کر اُٹھا اور دونوں ہاتھوں سے دروازہ کھول کر باہر جھانکنے لگا۔ لمبے برآمدے میں شام کی خاموشی تھی۔ گھسا ہوا سرخ قالین ایک سرے سے دوسرے سرے تک کمروں کے آگے آگے بچھا تھا اور سیڑھیوں کے پاس سٹول پر بیٹھے ہوئے بیرے کے علاوہ اور کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ غیر شعوری طور پر اختر نے مڑ کر دائیں جانب نظر ڈالی۔ کمرہ نمبر ۱۹ بند تھا۔

کمرے میں واپس آ کر اختر نے بیڈ لیمپ جلا کر اپنے فائبر کا سوٹ کیس کھولا۔ اور سارے کپڑے ایک ساتھ بستر پر انڈیل دیئے۔ خالدہ نے جس نفاست سے تمام کپڑے استری کروا کر اس میں بند کئے تھے۔ وہ ترتیب لمحہ بھر میں خراب ہو گئی۔ اختر نے اپنے سیاہ سوٹ کے ساتھ پہننے والی سرخ ٹائی کو ایک ہاتھ سے پکڑا اور پھر اسے اپنے سر سے لگا کر چھوڑ دیا۔ ٹائی کا موٹا سا ریشمی گاؤن کی ڈوریوں کے پاس جا پہنچا۔ یہ

سانپ سی ٹائی اس نے کونے میں پڑی ہوئی میز پر پھینک کر کہا۔ کسی کسی لڑکی کا جسم پھلتا پھولتا نہیں، بس بال ہی بڑھتے جاتے ہیں۔ فضول۔

کراچی پہنچتے ہی اسے چچا کو خیریت کا تار دینا تھا۔ لیکن ابھی تک وہ اپنے کمرے سے باہر نہ نکلا تھا۔ اسے یہ سارے کپڑے الماری میں لگانا تھے۔ شیو کرنا تھی، نہانا تھا۔ اور پھر خالدہ کو خط لکھنا تھا۔ تفصیلی الفت بھرا...... جس میں قدم قدم پر بار بار اس بات کا اعادہ کرنا تھا کہ یہ سارا سفر تمہیں یاد کرتے گزرا۔ یہاں اسٹیشن پر اکیلے اترتے ہوئے سخت جی گھبرایا۔ اور ہوٹل کی تنہائی اب کاٹنے کو دوڑ رہی ہے۔

سارے کام چھوڑ کر اس نے اپنا شیفرز پن نکالا۔ یہ اسے خالدہ نے پچھلی سالگرہ پر تحفہ دیا تھا اور ساتھ ہی یہ شرط بھی پیش کر دی تھی۔ کہ اس سے کسی اور کو خط نہ لکھنا۔ قلم اور کاغذ موجود تھے۔ لیکن عجب قسم کی سستی اور بے پروائی اس کے جسم اور روح پر چھائی تھی۔ وہ خوب جانتا تھا کہ خالدہ اس کا مستقبل ہے۔ خالدہ نہ آئی، تو کار نہ آئے گی۔ چچا کا کاروبار نہ آئے گا۔ لاہور کے بڑے بڑے ہوٹلوں میں ہر شام ستھری پلیس سوٹ پہن کر چائے پینے کے پیسے نہ ہوں گے۔

— یورپ کے سفر کہاں سے آئیں گے؟

— بنگلہ نہ ہوگا۔ عزت نہ ہوگی سٹیٹس نہ ہوگا۔

لیکن آج اس کا جی اس کام سے اکتا رہا تھا۔ سرہانے تلے اپنا پیڈ اور قلم رکھ کر اس نے خط لکھنے کا پروگرام رات پر ملتوی کر دیا۔ اور منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلنے لگا۔

باہر شام کی تمام سیاہی شہر کی روشنیوں نے چاٹ لی تھی۔ ہوٹل کے سامنے جگمگاتے سینما گھر اور ریستورانوں میں سے میوزک کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اختر آہستہ آہستہ برآمدہ پار کر کے جب سیڑھیوں کے شروع پر پہنچا۔ تو لفٹ مین نے جلدی سے لفٹ کا دروازہ کھول دیا۔ اس کی سفید رنگت اور لانبا سا قد دیکھ کر اختر کو خیال آیا کہ



اب اگر یہی آدمی ستھری پلیس سوٹ پہن کر اپنی کار سے اتر کر کسی ہوٹل میں چلا جائے تو کون جانے گا۔ بے چارہ لفٹ مین ہے.... فقط لفٹ مین۔

"سر؟" سفید وردی والے نے لفٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں بھئی۔ ذرا ورزش ہو جائے گی۔ شکریہ۔ چل کر نیچے جاؤں گا۔"

جب وہ چار سیڑھیاں نیچے کی جانب اتر گیا۔ تو ایک بار پھر اختر نے لفٹ مین کو دیکھا۔ وہ اپنے سٹول پر بیٹھ کر اوپر والے برآمدے کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ اختر اپنی چال میں وقار کو بڑھاتے ہوئے جب ہوٹل سے نکلا تو اسے دوسری جانب فٹ پاتھ پر سفید ساڑھی والی نظر آئی۔ وہ ہاتھ میں تیلیوں کا بنا ہوا چھوٹا سا بیگ لئے کھڑی تھی۔ سڑک کی روشنی میں اس کا رنگ بے حد نکھرا ہوا نظر آ رہا تھا۔

اختر کا ہاتھ اپنی بڑھتی ہوئی شیو کی طرف اٹھ گیا۔ اور یک دم احساس ہوا کہ یونہی بغیر نہائے دھوئے چہرے کی گھاس اتارے بنا ہوٹل سے اترنا انتہائی حماقت تھی۔ ایک چھوٹی سی پیلی ٹیکسی اس کے آگے سے گزر گئی۔ اس وقت اسے چچا کی بل ایر یاد آ رہی تھی۔ اگر اس وقت اس کار کا ساتھ ہوتا۔ تو وہ اس سانولی لڑکی پر کتنا کچھ اثر انداز ہو سکتا تھا۔ کاروں کا لڑکیوں پر عجیب رعب پڑ جاتا ہے لیکن یہاں چچا کی بل ایر ساتھ نہ تھی۔ اور نہ ہی وہ کسی طرح اس لڑکی پر ظاہر کر سکتا تھا کہ لاہور کی ایک کشادہ لمبی سی سڑک پر ان کا بنگلہ ہے۔ اپنی کار ہے۔ یعنی چچا کی کار اور بنگلہ ہے جو بہت جلد اس کا ہو جائے گا۔ کراچی کے قیام کو یادگار بنانے کے لئے اس نے یک دم اس سانولی لڑکی کا انتخاب کر لیا۔

"میاں ٹھیرو" ٹیکسی میں بیٹھ کر اختر نے ٹیکسی والے سے کہا: "وہ سامنے بی بی جی کو ساتھ لینا ہے۔ ذرا ٹیکسی اس طرف لے چلو۔"

ٹیکسی والے نے میٹر کا ہینڈل گھمایا اور ٹریفک پر نظر مار کر ٹیکسی دوسری جانب

کھڑی ہوئی لڑکی کی طرف موڑ لی۔

سمندری ہوا میں سفید ساڑھی کا پلّو اُڑ رہا تھا۔ بالوں کی چوٹی اب گنتھے ہوئے جوڑے کی صورت میں گردن پر بیٹھی تھی۔ گندمی مائل سانولے پیر چھوٹے چھوٹے سلیپروں میں پڑے تھے اور ناخنوں کی کیوٹکس اس روشنی میں سیاہ لگ رہی تھی۔ ٹیکسی بڑے مؤدب انداز میں ہولے ہولے اس کے پاس جا کر رک گئی چھوٹے چھوٹے پاؤں گھبرا کر دو تین قدم پیچھے ہٹ گئے۔

اختر نے پچھلی سیٹ پر آگے ہو کر کھڑکی میں سے اپنا چہرہ نکالا اور بڑی کانونٹ نما انگریزی میں بولا "چلئے آپ کو منزل پر پہنچا دوں؟"

پہلے تو لمحہ بھر اس لڑکی نے اختر کو پہچاننے سے انکار کر دیا۔ لیکن پھر وہ مسکرائی ہموار سفید دانت سڑک کی روشنی میں جگمگائے اور انکار کرتے ہوئے وہ بولی "جی نہیں مجھے برٹش ایمبسی تک جانا ہے۔ کسی رکشہ پر چلی جاؤں گی"

اختر نے جی میں سوچا۔ شاید اسے خیال آ رہا ہے کہ ٹیکسی کے پیسے میں ادا کروں گا اور اس طرح یہ میرے احسان تلے آ جائے گی۔ کاش اپنی بل ایئر یہاں ہوتی۔ کاش۔

پھر اس نے مسکراتے ہوئے کہا "میں آپ کو ایمبسی تک چھوڑ آؤں گا"

"جی نہیں شکریہ"

"لیکن ... ... ..."

بائیں ہاتھ میں بندھی ہوئی اپنی چھوٹی سی گھڑی کو وہ کان سے لگا کر بولی "جی نہیں مجھے کوئی ایسی جلدی نہیں"

اختر نے بے پرواہی سے کندھے جھٹک کر کہا "وہ آپ کی مرضی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ آپ عورت ہیں، اور اکیلی کھڑی ہیں ... ... اپنی سواری OFFER کر دوں"



لڑکی نے دایاں بازو لٹکا دیا۔ تیلیوں کا پرس اس کے گھٹنے کو چھونے لگا ... وہ آہستہ سے بولی "یہاں کے لوگ بہت KIND ہیں۔ بہت GENEROUS۔ لیکن پھر بھی شکریہ"

کچھ دور آ کر ٹیکسی کا انجن ہولے ہولے بند ہو گیا۔ اختر نے مڑ کر دیکھا تو سفید ساڑھی والی مسکرا رہی تھی۔ اور اس کی مسکراہٹ میں طنز تھا۔ زہرخند تھا۔

چچا کو تار دیئے بغیر اگلے موڑ سے اختر پلٹ آیا۔ لیکن گردن پر سیاہ جوڑے کا بوجھ اٹھائے وہ ایمبسی کی طرف جا چکی تھی۔ ٹیکسی کو ٹپ اور پیسے دینے کے بعد وہ لفٹ میں چڑھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ سمر کا کوٹ پلنگ پر پڑے ہوئے کپڑوں پر پھینک کر اس نے قلم اور پیڈ نکالا۔ اسے یک دم خالدہ بہت یاد آنے لگی تھی۔ ہوٹل کا پتہ رقم کرتے ہی اس نے لکھا۔

بہت پیاری خالدہ ـــــ!

راستہ بھر تم بہت یاد آتی رہیں۔ عجب بے تکا سفر ہے۔ یعنی تمہاری زلف دوتا کی طرح (انگریزی فیشن کے بال کٹوانے سے پہلے) کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتا۔ آج کا سارا دن سونے میں گزرا۔ ایک لطف کی بات بتاؤں آج شام کو ایک کریک سی لڑکی کمرہ بھول کر میرے کمرے میں آ گئی۔ جی چاہتا ہے کہ اس کا فول بناؤں لیکن پھر تمہاری صورت میری آنکھوں میں آ جاتی ہے اور تمہاری ہم جنسوں پر رحم آ جاتا ہے۔ وغیرہ ـــــ

تمہاری سب فرمائشیں مجھے یاد ہیں۔ دیکھو چچا کو یاد دہانی کرا دینا کہ میری کلب کا چندہ بھجوانا نہ بھول جائیں۔

اور کچھ جان من؟

تمہارا تھکا ہوا

اختر

خط لکھ کر اس نے بیڈ لیمپ کے پاس رکھ دیا، پھر بیڈ لیمپ اور چھت کی بتی بجھا کر آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ سگریٹ سلگا کر اس نے ایک لمبا کش لیا۔ فضا میں تمباکو کی دھیمی دھیمی خوشبو کا بھبھکا اُٹھا۔ اختر نے لمبی سانس لی۔ اور سوچا۔ آج کا دن بھی رائیگاں گیا۔ چھٹیوں کا پہلا دن، فراغت کی پہلی گھڑیاں! کچھ بھی تو قابلِ ذکر نہ ہوا آج!

اگر وہ آج لاہور میں ہوتا تو خالدہ اور چچا کو ساتھ لے کر وہ کسی سینما گھر جاتے رات کا کھانا کسی فیشن ایبل ریستوران میں کھانے کے بعد وہ گھر لوٹتے۔ کراچی میں پہلی بار اسے تنہائی کا احساس ہوا۔ گہری تنہائی اور اداسی کا احساس۔ اس نے نائٹ سوٹ پہنا اور کھانا کھائے بغیر پلنگ پر لیٹ گیا۔

چائے پاس پڑی ہوئی ٹھنڈی سی پڑنے لگی۔ انڈے کا آملیٹ کھانے کے بعد اختر نے اخبار کھول لیا۔ اور وہ دلچسپی کے ساتھ ہیڈ لائنز پڑھنے لگا۔

ہوٹل کے ڈائننگ روم میں اکا دکا لوگ اب ناشتہ کھا رہے تھے۔ سارے کمرے میں تلی ہوئی کلیجی گریپ فروٹ اور چائے کی ملی جلی خوشبو پھیلی تھی میزوں پر رکھے ہوئے گلدانوں میں نازک نازک پھول بڑی نفاست سے سجے ہوئے تھے۔ اور دبے پاؤں چلنے والے بیروں کی آمد و رفت سرخ قالین پر محسوس تک نہ ہوتی تھی۔

اختر نے اخبار پرے کر کے کلیجی کا ٹکڑا منہ میں ڈالا اور چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگا کر ڈائننگ ہال پر نظر ڈالی۔ اس سے قریباً پانچ میز ادھر کنول نینی بیٹھی تھی اس کی پشت اختر کی جانب تھی۔ اور سرویٹ گھٹنوں سے کھسک کر قالین پر جا پڑا تھا۔ آج بھی اس نے سفید ساڑھی پہن رکھی تھی، صرف آج اس کے پلو میں زرد رنگ کی لائنیں تھیں۔ اور پشت کے کچھ حصے پر پستئی رنگ کا بلاؤز نظر آ رہا تھا۔ بالوں کی چوٹی کرسی پر دو بل کھا کر اس کے سر سے جا چپٹی تھی۔ اختر نے ایک بار پھر نظریں اخبار پر جما دیں۔ لیکن دوسرے لمحے اس نے اخبار کے کنارے سے پھر اسی میز کی طرف دیکھا۔ وہ بیرے سے



کچھ کہہ رہی تھی۔ پھر وہ اُٹھنے لگی۔ لیکن بیرے نے کچھ ایسی بات کہی کہ وہ بیٹھ گئی۔ اور میز پر کہنی ٹکا کر دیوار کی طرف دیکھنے لگی۔ اختر نے دیوار کی جانب نظریں گھمائیں۔ وہاں لاہور کے ایک مشہور آرٹسٹ کی تصویر آویزاں تھی۔ سرخ نیلے اور زرد رنگ کی آمیزش سے تجریدی آرٹ میں خزاں کا منظر دکھایا گیا تھا۔ اختر نے اخبار میز پر رکھ دیا اور سرویٹ سے منہ پونچھ کر کنول نینی کی میز پر چلا گیا۔

"مزاج شریف!"

سفید ساڑھی والی نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔ اتنی چھوٹی سی لڑکی کے سامنے پہلی بار اختر کو اپنا لمبا قد مضحکہ خیز لگا۔ اس نے ایک کرسی پر ہاتھ رکھ کر ذرا کمر کو خم دے کر کہا: "ایک چھت تلے رہتے ہوئے ایک طرح سے ہم ہمسائے ہیں۔ مزاج شریف؟"

وہ مسکرا دی۔ سیاہ لمبی لمبی آنکھوں کا سحر اور بڑھ گیا۔

"میرا نام اختر علی خان ہے۔ لاہور میں رہتا ہوں۔" اختر نے اس کا سرویٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔

بڑے تکلف سے سرویٹ پکڑتے ہوئے کنول نینی بولی: "صوفیہ ربیع الدین ڈھاکہ۔ مشرقی پاکستان۔"

اختر مسرور ہو کر بولا: "یعنی پھر تو ہم ایک طرح سے ہم وطن ہوئے۔"

"ایک طرح سے کیا معنی؟" صوفیہ کے ابروؤں پر بل پڑ گئے۔ "کیا ہم وطن نہیں ہیں؟"

بڑی خندہ پیشانی سے اختر نے کہا: "لیکن درمیان میں آپ کی غیریت بھی تو ہے۔"

"غیریت۔ کیا معنی؟ میں سمجھی نہیں۔"

اختر نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بات کی: "ہم وطن جہاں بھی ہوں ہم وطن

رہیں گے۔ لیکن کل شام آپ نے اس اپنائیت کا ثبوت نہیں دیا۔"

"میں نے۔ یعنی میں نے کیا کیا تھا؟" اس نے بڑی سادگی سے پوچھا۔

"آپ نے مجھ پر اعتماد نہیں کیا تھا اور میرے ساتھ ٹیکسی میں نہیں بیٹھی تھیں۔" اس نے گلہ آمیز لہجے میں کہا۔

مکئی کے دانوں کی طرح ہموار اور ہاتھی دانت کی طرح سفید دانت کنول نینی کی مسکراہٹ میں شامل ہو گئے۔

"میں یہاں اجنبی ہوں۔ اور کسی کو نہیں جانتی۔"

"اس کے یہ معنی ہوئے کہ جو فاصلہ جغرافیائی حدود نے قائم کیا ہے۔ وہ دوری آپ کے دل میں بھی بستی ہے۔" اختر نے سوال کیا۔

"میں آپ کا مطلب سمجھی نہیں۔" اس نے پھر سادگی سے پوچھا۔

"یعنی آپ مجھے اپنا ہم وطن نہیں سمجھتیں ورنہ آپ کو اعتبار کرنے سے پہلے جاننے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔" اختر نے جلدی سے ذہانت بھری بات سوچی۔

ایک بار پھر مکئی کے دانے مسکرا اٹھے۔

"یہاں کے لوگ باتیں بڑی ذہانت سے کرتے ہیں۔"

"لیکن دراصل ذہین نہیں ہیں۔" اختر نے ابرو اٹھا کر پوچھا۔

اس بار مکئی کے دانوں سے چھلکنے کی آواز آئی۔ ہلکا سا قہقہہ گلدان کے پھولوں سے ٹکرا گیا۔

"آپ میری بات گول کر رہی ہیں۔ آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے نا؟"

اس نے زرد لائنوں والا پلو کندھے پر کرتے ہوئے کہا۔ "یہ میں نے کب کہا تھا اختر صاحب۔"

"پھر کل والی بے انصافی کی تلافی کر دیجئے نا؟"



"تلافی؟ کیسی تلافی؟"

"یہ دکھانے کے لئے کہ آپ کے دل میں جغرافیائی فاصلے نہیں ہیں۔ آپ کو میرے ساتھ باہر جانا ہوگا۔"

"باہر۔ سیر وغیرہ کے لئے یعنی؟" اس نے ڈر کر پوچھا۔

"جی ہاں۔ کلفٹن، ہاکس بے وغیرہ۔"

"یہ تو ممکن نہیں مجھے ایمبسی میں کچھ کام ہے۔ ورنہ شاید۔"

اختر کا دماغ حاضر تھا۔ اس نے جھٹ کہا۔ "ورنہ شاید میں کوئی اور بہانہ تراش لیتی۔"

بیرا چھوٹی سی ٹرے میں چند روپے اور کچھ ریزگاری ڈال کر لے آیا۔

"خط پوسٹ کر دیئے تھے؟" صوفیہ نے بیرے سے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"پہنچ تو جائیں گے نا؟" اس نے پھر تفتیش کی۔

اتنے بڑے ہوٹل میں اتنی چھوٹی سی بات پر بیرے سے یوں جرح کرنا اختر کو معیوب سا لگا۔ اس نے نظریں میز پر لگا دیں۔

صوفیہ کے سیاہ پرس کے ساتھ ایس اے ایس لائنز کا ایک ٹکٹ رکھا تھا۔

چاندی کی ٹرے میں سے صوفیہ نے سارے پیسے اٹھا لئے اور صرف دوئنی رہنے دی۔ اختر نے کنکھیوں سے اس دوئنی کی طرف دیکھا۔ وہ بیرے سے آنکھیں دوچار کرنا نہ چاہتا تھا۔ اسی کام کے لئے اس ہوٹل میں اس کی ایک روپیہ ٹپ مقرر تھی۔ لیکن پھر یہ سوچ کر کہ شاید اس کنجوسی کی وجہ صوفیہ کی لاعلمی ہو اس نے چہرہ اٹھا کر بیرے کی طرف دیکھا۔ اس کے ابرو اور جبڑے ناخوشی سے اکڑے ہوئے تھے۔ ہلکا سا سلام کر کے پشت کی طرف چاندی کی ٹرے لئے وہ چلا گیا۔ تو ایک مرتبہ

پھر گفتگو کا سلسلہ جاری کرتے ہوئے اختر بولا: "تو چلئے آج میں آپ کو ایمبسی تک پہنچا آؤں۔"

صوفیہ نے بہانہ تلاش کرنے کے لئے بٹوہ کھولا۔ اور پھر اس میں ایس لے این کا ٹکٹ دھر لیا۔ اس کے چہرے سے ناراضگی عیاں تھی۔

اختر نے اس کے تیور تو بھانپ لئے تھے۔ لیکن وہ اس دھان پان سی لڑکی پر چھانے کا عہد کر چکا تھا۔

اس نے اڑیل ٹٹو کی طرح کہا۔ "بات یہ ہے حب الوطنی کی کسی کتاب میں یہ بھی رقم نہیں کہ ہر ہم وطن کے ساتھ ایک ہی ٹیکسی میں سفر کرنا لازم ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی چلئے۔"

جب وہ دونوں سیڑھیوں پر پہنچے۔ تو اختر نے مسرت کے ساتھ نوٹ کیا۔ کہ سفید وردی والا لفٹ مین اپنی سیٹ پر موجود نہ تھا۔ لیکن لفٹ سیڑھیوں کے چوکھٹے کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ لفٹ میں گھس کر اس نے بٹن دبایا۔ جنر جنر کی آواز آنے لگی۔ اور آہستہ آہستہ لفٹ نیچے کی طرف کھسکنے لگی۔

"آپ کے دیس میں کیا تمام لڑکیاں اتنی ہی خوبصورت ہوتی ہیں مس رفیع الدین" اس نے پوچھا۔

وہ لفٹ کے ایک کونے میں لگی کھڑی تھی اور اختر کے مقابلے میں بہت چھوٹی نظر آ رہی تھی۔

اس نے مسکرا کر کہا: "اور شاید آپ کے لاہور میں سبھی لوگ اتنے خوشامدی ہوتے ہیں؟"

دونوں بے ساختہ ہنس دیئے۔ اور لفٹ نچلی منزل کی گیلری میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ لفٹ میں سے نکلتے ہوئے صوفیہ نے کہا: "آپ پٹھان ہیں نا؟"



"جی۔ آپ نے کیونکر اندازہ لگایا؟"

"آپ کے نام سے۔"

اختر نے اس کے برابر ہوتے ہوئے پوچھا: "اور اس اندازے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟"

صوفیہ نے ذرا سا چہرہ اختر کی طرف پھیرتے ہوئے کہا: "اس لئے کہ سنا ہے کہ پٹھان قوم بڑی دلیر ہوتی ہے۔ اور کبھی پیٹھ کی طرف سے حملہ نہیں کرتی ——"

اختر بھی جانتا تھا کہ ایسی روایات اس قوم سے وابستہ تھیں۔

"یعنی اس وقت یہ روایت آپ کو کیوں یاد آئی؟"

"خوشامد پیٹھ کی طرف سے وار کرنے کے مترادف ہوتی ہے۔ اگلا انسان بچ نہیں سکتا۔"

اختر خاموش ہو گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہاں ذہانت سے پالا پڑا ہے۔ قدم پھونک پھونک کر دھرنا ہوگا۔ ورنہ اسے زیر کرنے سے پہلے کہیں میں ہی نہ مارا جاؤں۔

لمبی سی بیوک ٹیکسی کا دروازہ کھول کر ڈرائیور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ زرد بلاؤز والی کی کمر بہت پتلی تھی۔ اس کے گرد لپٹی ہوئی ساڑھی کی زرد لکیریں اور کمر کو دیکھ کر خوامخواہ اختر کو اپنے دیس کی زرد بھڑ یاد آ گئی۔ وہ کار کے ایک کونے میں ان جانی سی الگ تھلگ ہو کر بیٹھ گئی۔ اور باہر کی طرف دیکھنے لگی۔

اختر نے لمبی لمبی ٹانگیں سمیٹ لیں۔ پھر بھی اگلی سیٹ کی پشت سے اس کے گھٹنے تھوڑی ہی دور رہ گئے۔

"ایمبسی ...... برٹش ایمبسی" اختر نے تفصیل سے ایڈریس سمجھاتے ہوئے ڈرائیور سے کہا۔

ٹیکسی روانہ ہو گئی۔ کنول نینی اس طرح خاموش تھی۔ گویا یہاں سے کوسوں

میل دور بیٹھی ہو۔

"آپ ایمبیسی میں کب تک ٹھہریں گی؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتی۔ شاید دس منٹ لگیں، اور شاید دو گھنٹے لگ جائیں۔"

اختر نے اپنے ابرو اٹھا کر پوچھا: "اتنا غیر متعین کام ہے کیا؟"

اب وہ سادہ سی لڑکی بن گئی تھی۔ جس میں نہ کوئی ڈھنگ تھا نہ کوئی نہج۔ اس نے بڑی میٹھی آواز میں کہا: "لندن میں جس ہاسٹل میں مجھے اترنا ہے۔ اس کے متعلق کچھ گڑبڑ پیدا ہو گئی ہے۔ بس اس کا فیصلہ کرنا ہے۔"

"تو آپ لندن جا رہی ہیں؟"

"جی۔"

اختر نے آرام سے بیٹھتے ہوئے کہا: "تو صبح چائے کی میز پر وہ آپ کا ہی ہوائی ٹکٹ تھا؟"

"جی۔"

"تو آپ سیدھی ڈھاکہ سے ہی کیوں نہ چلی گئیں۔ یہاں کے لوگوں سے آپ کو کیا تکلیف پہنچی تھی بھلا؟"

"آپ کی باتیں واقعی میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ شاید میری اردو کمزور ہے۔" اس نے سادگی سے کہا۔

"میرا مطلب ہے۔ آپ کو یہاں آنا کیا ضروری تھا؟"

اس کی آنکھوں میں بڑی گہری دلچسپی اور انہماک کی روشنی جاگ اٹھی۔ اس نے گھٹنے اختر کی طرف کر لئے۔ اور ان پر دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"اس لئے میں نے اپنا سفر توڑا ہے کہ جب لندن کے لوگ مجھ سے مغربی پاکستان کے بارے کچھ پوچھیں گے۔ تو بھلا کیا جواب دوں گی۔ جب تک کچھ



GENERAL IMPRESSION موجود نہ ہو۔ تو انسان وثوق سے کیا کہہ سکتا ہے؟"

"اور اب آپ نے مغربی پاکستان کے متعلق کیا اندازہ لگایا ہے۔؟"

وہ ہنس دی۔

"پھر بھی؟" اختر نے اصرار کیا۔

"یہاں کے لوگ لمبے ہیں، گورے ہیں اور ہمیشہ پیٹھ کی طرف سے حملہ کرتے ہیں۔"

وہ دونوں ہنس دیئے۔

ٹیکسی ایک ہلکے سے دھچکے کے ساتھ رک گئی۔ صوفیہ نے پرس اٹھایا اور فٹ پاتھ پر اتری۔ اس کے گندم گوں ٹخنے اور تھوڑی سی پنڈلی پر اختر کی نظر جم گئی۔

"آپ کب تک یہاں ٹھہریں گی۔ میں آپ کا انتظار کروں گا۔"

"جی نہیں۔ تلافی ہو چکی۔ اب انتظار کے لئے کسی اور موقع کی تلاش کیجئے۔۔"

کنول مینی غائب ہو گئی۔

اختر نے پھر ایک بار اپنے جی سے بات کی۔ جتنی ذہانت کے ساتھ مقابلہ ذرا سوچ سمجھ کر کرنا ورنہ خالدہ کو کیا منہ دکھلاؤ گے۔

پھر سر جھٹک کر اختر نے اپنے جی سے کہا۔ چھوڑو خالدہ بیچ میں کہاں سے آ ٹپکی۔

وہ واپس آ کر کار میں بیٹھ گیا۔ لیکن جب وہ ہاؤسنگ سوسائٹی نشاط منزل سے لوٹا، اور ایمبیسی پہنچا۔ تو صوفیہ جا چکی تھی۔

صبح اختر بہت دیر سے جاگا۔

رات کو پتہ نہیں اسے نیند کیوں نہ آئی۔ کلب کی زندگی، کالج کا زمانہ، اور خالدہ کے گھر گزارا ہوا عہد ہولے ہولے اسے یاد آ تا رہا۔ بچپن میں ہی اس

کے والدین کا انتقال ہو گیا تھا۔ لیکن اس کی چچی نے جو اس کی خالہ بھی تھیں، اس کی سرپرستی کا بیڑا اٹھا لیا۔ چچی اس کے لئے ماں کا سمبل تھی اور جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔ اسے یہ ماں کا سمبل سا اس میں بدلتا نظر آتا تھا۔ اس سرپرستی کا حق چچی اور چچا نے نہایت حسن و خوبی سے ادا کیا۔ ایک عرصہ تک اختر کو یہ بھی علم نہ ہو سکا کہ چچا چچی اس کے سگے ماں باپ نہیں ہیں۔ وہ ہمیشہ کی طرح خالدہ کے ساتھ سکول جاتا اور کار ہی میں واپس آتا رہا۔ اس کی سالگرہ زیادہ دھوم دھام سے منائی جاتی۔ چچی چچا اسے زری کی اچکن پہنا کر خود سالگرہ کی صبح چڑیا گھر لے جاتے۔ دوپہر کو کھانا کسی ریستوران میں کھلایا جاتا اور شام کو اس کے دوستوں کی دعوت ہوتی۔ گھر میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک رنگین کاغذوں کی پھریریاں، زنجیریں اور رنگ برنگے غباروں کا سیلاب آجاتا۔ اس کے کمرے میں لمبی میز لگا کر تحفے سجائے جاتے۔ اور مال کی ایک مشہور بیکری سے اس کی سالگرہ کا کیک آتا۔

چچی کرن لگا دوپٹہ سنوار کر اسے اپنی گود میں اٹھا لیتیں۔ اور وہ ہاتھوں میں چھری سنبھال کر آنکھیں میچ کر کیک میں لگی ہوئی موم بتیاں بجھاتا۔ چچی کا سانس اسے اپنی گالوں پر محسوس ہوتا۔ جیسے وہ بھی اس کے ساتھ بتیاں بجھا رہی ہیں۔ کیک پر چھری پڑتے ہی باہر پولیس کا بینڈ بجنا شروع ہو جاتا۔ اور اس کے سکول دوست تالیاں پیٹتے، قہقہے لگاتے۔ رات کو چچی اپنی سہیلیوں کی دعوت کرتیں۔ دراصل اختر کو صبح سے ہی اس رات کے ڈنر کا انتظار رہتا۔ رات کو چچی کی ہر سہیلی اس کے لئے کوئی نہ کوئی قیمتی تحفہ لاتی تھی۔ اور چپکے چپکے آئندہ سال کے نئے اختر ان سے نئے وعدے بھی کروا لیا کرتا تھا۔

چچی اپنی دوستوں کے پاس ڈرائنگ روم میں بڑے دیوان پر بیٹھ جاتیں۔ خالدہ اور اختر ان کے دائیں بائیں ہوتے۔ سارے کمرے میں آتش دان کی بھڑکتی



لکڑیوں کی مہک اور حدت ہوتی۔ ڈرائی فروٹ توڑنے، چٹخنے اور گریاں نکلنے کی مزیدار آوازیں آتیں۔ اور چچی فخر سے اختر کے سر پر ہاتھ پھیر کر اپنی ایک ایک ملنے والی سے پوچھتیں: "اختر کتنا خوبصورت نکل آیا ہے۔ ہے نا۔ اس کا روپ تو خالدہ سے بھی سوا ہے۔"

چچی کا دیوان پر بیٹھنا امارت اور حسن کے غرور سے گردن اکڑا اکڑا کر باتیں کرنا آج بھی اسے اچھی طرح یاد تھا۔ اتنے سال گزر جانے کے بعد ان کے انداز نہ بدلے تھے۔ بالوں میں مہندی کی سرخی تھی۔ لیکن بال کٹوائے جا چکے تھے۔ چہرے پر عمر نے لکیریں ڈال دی تھیں۔ لیکن اس چہرے کو منہ اندھیرے بھی اختر نے بغیر میک اپ کے نہ دیکھا تھا۔ دراصل اختر سمجھ ہی نہ سکتا تھا کہ کوئی عورت بھڑکتی لپ اسٹک کے بغیر توجہ بھی بٹور سکتی تھی۔ عمدہ لباس کے بغیر بھی اس کا جسم خوبصورت لگ سکتا ہے۔

دسویں جماعت میں ہی خالدہ نے بھی بال کٹوا دیئے تھے اور کالج میں پہنچتے ہی ٹینس کھیلنے لگی۔ اس کے حسن کو میک اپ کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن چھوٹی عمر میں ہی چاند نے گہنے پہننا شروع کر دیئے اور اختر کو کبھی اس سجی بنی خالدہ کے سنگار پر اعتراض بھی نہ ہوا۔ وہ اور خالدہ جب کبھی چچی کے ساتھ ریستوران میں پہنچتے اور اختر کے کالج بوائز اس جوڑے کو دیکھ لیتے تو کئی دنوں تک ان دونوں کے گمبیر اور حسن کی باتیں ہوتیں۔

خالدہ کی سہیلیاں کالج میں کہتیں: "ارے خالدہ تمہارا کزن تو تم سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔"

اور اختر کے بے تکلف اس سے کہتے: "بھائی خالدہ کو دیکھ کر تو ہم بالکل قائل ہو گئے۔ سر سے پیر تک۔"

جوں جوں دن گزرتے گئے۔ قدم قدم پر اختر نے لوگوں کو قائل کرنے کے لئے

اپنی دولت، تعلیم، وجاہت اور خاندان کے نام کو استعمال کیا۔ لڑکیوں کا تو شمار ہی کیا تھا۔ اچھے اچھے گھرانوں میں اس کی مارکیٹ ویلیو بہت زیادہ تھی اور اختر اس قیمت کے احساس سے اپنی وقعت خود اپنی نظروں میں بڑھانے کا عادی تھا۔ کالج کے زمانے تک تو چچا چچی اس کی ہر خواہش کا احترام کرتے رہے۔ لیکن اب اسے ان کی ضرورت نہ تھی۔ چچا کی بزنس میں شریک کار ہونے کے بعد اس نے وہ تمام آسائشیں اپنے لئے حلال کر لیں۔ جو پیسہ مہیا کر سکتا تھا۔ اس کا دفتر گو بازار کے ایک کونے میں تھا۔ اور اس کے بالمقابل مچھلی کی دکان اور کیک پیسٹری والوں کا ایک ننھا سا کیفے تھا۔ لیکن اختر نے اندر سے اپنے دفتر میں وہ ٹیپ ٹاپ اور خوبصورتی پیدا کر لی تھی کہ گاہک جونہی اندر گھستا اُسے بلیک مارکیٹ ریٹ سن کر نہ تعجب ہوتا اور نہ ہی وہ سودا بازی کرنے کے اہل رہ جاتا۔

جب بزنس میں پہلے اختر نے قدم رکھا تو چچا اس ظاہری ٹھاٹھ کے قائل نہ تھے وہ اختر سے کہتے: "میاں میں نے اور تمہارے ابا نے یہ بزنس کاغذ کا ایک دم بیچ کر شروع کیا تھا۔ دھیلا دھیلا، پائی پائی جوڑی ہے۔ خوامخواہ دیواروں پر پالش کرنے سے بزنس کا اثاثہ کم ہو گا۔"

اختر اپنی گول گھومنے والی کرسی ان کی طرف پھیر کر جواب دیتا۔ "چچا جان اگر تعلیم کے بعد بھی میں اس دفتر کا وہی معیار رکھوں، تو لعنت ہے میری زندگی پر —— آپ دیکھئے تو سہی۔ یہ پالش کا زمانہ ہے۔ گاہک سے مسکا پالش لگائیے گھروں پر رنگ روغن کیجئے، اپنے جسم کو بنائے رکھئے، دفتر کو سجائے رکھئے۔ خود ہی ہن برسنے لگے گا۔ خود ہی۔"

عموماً نوجوانوں کی باتیں ٹھیک نہیں ہوا کرتیں، لیکن یہاں بھی اختر کی بات ٹھیک نکلی اور دن بدن ان کی ساکھ بڑھنے لگی۔ بیرونی ممالک سے لین دین بڑھ گیا۔



آرٹ پیپر اور فارن کتابیں دھڑا دھڑ آنے لگیں۔ اور چچا جان خالدہ کے مستقبل سے مطمئن ہو کر زیادہ دیر گھر ہی رہنے لگے۔

دفتر کی کامیاب زندگی نے جیسے کندھا دے کر اختر کی انا کو اور بھی مضبوط، دلچسپ اور مغرور بنا دیا تھا۔ جب بل ایئر کو اسی میل کی سپیڈ پر چلاتا وہ اپنی کلب میں پہنچتا تو کلب کی زندگی میں ننھے منے بھنور پیدا ہو جاتے۔ معمر عورتیں اپنی لڑکیوں کے لئے موزوں بر دیکھ کر اس کے قریب آجاتیں اور نوجوان لڑکیاں اس کی وجاہت اس کی امارت اور اس کی ذہانت کے بوجھ تلے آہیں بھرنے لگتیں، وہ جانتا تھا کہ عورتیں اسے انگریزی میں "دل کی دھڑکن" پکارا کرتی تھیں۔ اس نام کو اپنے لئے استعمال ہوتے دیکھ کر اس کی انا اور بھی پھن اٹھاتی۔ اور اس کی قوت تسخیر سمجھتی۔ گویا کوئی انسان اس کی دلفریبی کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔

پچھلے سالوں میں یہ پہلا واقعہ تھا۔ جب وہ ایک لڑکی کے ساتھ ملنے کے بہانے تلاش کر رہا تھا اور وہ اس طرح پھسلی جا رہی تھی۔ گویا اس نے مٹھی میں پارہ بھینچنے کی کوشش کی ہو۔ اُسے صوفیہ سے محبت تھی نہ عشق۔ لیکن اس کی بے اعتنائی اور گریز پا انداز اس کے لئے خلش کا انداز ضرور بن گیا تھا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی کسی سادہ، بغیر میک اپ والی لڑکی کو قابل توجہ نہ سمجھا تھا۔ وہ انہیں اپنے معیار سے گھٹیا سمجھتا تھا حسن سے عاری۔ گلیمر سے خالی ایسی لڑکیوں کے ساتھ انسان کی عزت کبھی نہیں بڑھتی۔ انہیں لے کر انسان اگر کبھی کسی ریستوران میں چلا بھی جائے تو کوئی بھی سر اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ ایسی لڑکی جب چار چار چھریاں کانٹے دیکھتی ہے۔ تو نروس ہو کر اس کے اپنے ہاتھ سے پانی کا گلاس گر جاتا ہے اور پھر انسان سر اٹھا کر کسی کی طرف بھی دیکھنے جوگا نہیں رہتا۔ ایسی لڑکیاں اس کے گھرانے میں اب بھی پائی جاتی تھیں۔ لیکن ان دقیانوسی اور پرانے فیشن کے لوگوں

کا خالدہ اور وہ مل کر خوب مذاق اڑایا کرتے۔ ان سے وہ کبھی باتیں نہ کرتا ان کے ساتھ اس کی کوئی میل ملاقات بھی نہ تھی، وہ انہیں پینڈو چیپٹر کہا کرتے تھے۔

لیکن پچھلی رات اس نے پلنگ پر اوندھے لیٹ کر کئی گھنٹے گزار دیئے۔ صوفیہ ربیع الدین سادہ تھی۔ لیکن اس سادگی میں نروس پن نہیں تھا۔ اس کے گھٹنے سے نیپ کن پھسل کر قالین پر گر تا تھا۔ لیکن وہ گھبراتی نہیں تھی پھر اسے خیال آتا کہ آخر صوفیہ نے بیرے کو دوگنی ٹپ کیوں دی؟ کیا وہ غریب تھی یا اسے امیروں کے انداز ٹپ کا علم نہ تھا۔

سفید کاٹن کی دھوتی پہنے بالوں کی چوٹی لٹکائے کوئی لڑکی اس سے گریزاں بھی ہو سکتی ہے۔ سانولی صورت اور چھوٹا سا دبلا پتلا جسم۔ بغیر میک اپ کا چہرہ جاذب نظر بھی ہو؟ اس کی تو اسے کبھی توقع بھی نہ تھی۔

صبح جب اختر کی آنکھ کھلی تو پورے گیارہ بج چکے تھے۔ گھڑی کو دیکھتے ہی اسے خیال آیا کہ صوفیہ ناشتہ کر کے ڈائیننگ روم سے جا چکی ہوگی۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے اپنا تکیہ زور سے غسل خانے کے دروازے سے دے مارا اور اونچی آواز میں بڑبڑایا "جاتی ہے تو جائے۔ یہاں کون پروا کرتا ہے۔ ایسی FALSE MODESTY ہماری آزمائی ہوئی ہے۔"

پھر اس نے سلیپروں میں پاؤں ڈالے اور غسل خانے کی طرف چل دیا۔ پیر سے تکیے کو ٹھوکر مار کر پرے کیا۔ اور اندر گھس گیا۔ سفید چینی کے ٹب کا نلکہ کھول کر اس نے سنک کے اوپر لگے ہوئے شیشے کو دیکھا۔ داڑھی کی جلد سبزی مائل ہو رہی تھی اور آنکھوں تلے حلقے تھے۔ اس نے چہرے پر ہاتھ پھیر کر اپنی نیلی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اور اپنے عکس سے انگریزی میں کہا "بڑے لڑکے ہوشیار!"

بیرے نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی تو غسل خانے کا دروازہ اندر



سے بند پایا۔ ایک منٹ انتظار کرنے کے بعد اس نے پیتل کے نوب کو گھمایا اور چاندی کی طشتری میں اختر کا خط لئے اندر آ گیا۔ وہ چاہتا تو اس خط کو میز پر رکھ کر واپس جا سکتا تھا۔ لیکن بیرے کو علم تھا کہ صاحب ایسے ہوائی خطوں کا ہمیشہ ایک روپیہ ٹپ دیتے ہیں۔ اس لئے وہ کمرے کی چیزیں ترتیب سے لگانے لگا سنگار میز پر چاندی کا کنگھا اور برش جھاڑ کر لگایا۔ کوئی درجن بھر ملائمت قائم رکھنے کی چیزیں اور لوشن تھے۔ انہیں جھاڑن سے پونچھ کر رکھا اور پھر قطار در قطار بے ترتیبی سے پڑی ہوئی خوشبو کی شیشیوں کو غور سے دیکھنے کے بعد اس نے ایک بڑی بوتل کھولی اور دو قطرے اپنی سفید وردی پر انڈیل لئے کمرے میں فرانسیسی سینٹ کی ہلکی سی مہک پھیلی اور باسی فلٹ کی باس میں گھل مل گئی۔

جس وقت غسل خانے کا دروازہ کھلا۔ بیرا اختر کا بستر لگا رہا تھا۔ اختر نے کمر کے گرد بڑا تولیہ لپیٹ رکھا تھا۔ اور باقی جسم پر کوئی کپڑا نہ تھا۔ بالوں میں سے ننھی ننھی پانی کی بوندیں اتر کر کانوں اور ماتھے پر لڑھک رہی تھیں۔ اور اس کی شفاف جلد سے صابن کی خوشبو اٹھ رہی تھی سفید سبزی مائل جلد اب ہاتھی دانت کی طرح سفید اور آب دار نظر آتی تھی۔

اسے دیکھتے ہی بیرے نے جلدی سے سلام کیا۔ اور کمر میں پہلے سے بھی زیادہ خم پیدا کر لیا۔

"کیا حال ہے نور دین؟" اختر نے خوش خلقی سے پوچھا۔

"حضور کو دعا دیتے ہیں۔"

"کبھی اپنے پونچھ نہیں گئے پھر؟" اختر نے ذہن پر زور دیتے ہوئے سوال کیا۔

"پچھلے سال ہزارہ گیا تھا صاحب لیکن ہوٹل والوں سے سر کاریچھٹی نہیں ملتی۔"

"ہوں۔"

اختر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے پڑی ہوئی تپائی پر بیٹھ گیا اور تازہ ڈھلے ہوئے جسم پر پاوڈر چھڑکنے لگا۔

"حضور کا خط ہے۔" نور دین بولا۔

پھر اس نے خط چاندی کی طشتری میں رکھا بایاں ہاتھ کمر کی جانب کیا اور دائیں ہاتھ سے جھک کر خط حضور کو پیش کیا۔ اختر نے خط پر ایک نظر ڈالی۔ نیلے ہوائی لفافے پر خاکدہ کی لکھائی تھی۔ اس نے خط کو چپکے سے اٹھایا اور اپنے سامنے کریم اور سینٹوں کی شیشیوں پر ڈال دیا۔ اس کے سارے جسم سے پاوڈر کے بھبھاکے اٹھ رہے تھے۔

"نور دین وہ سامنے میز پر سے ایک روپیہ اٹھا لو۔"

"حضور کا ہی دیا کھاتے ہیں سرکار۔"

"پھر بھی وہ پینڈ کے اوپر پیسے پڑے ہیں۔"

نور دین نے سنگھار میز کی جانب پشت کر لی اور چپکے سے دو روپے ہتھیلی میں اٹھا لئے پھر دروازے پر پہنچ کر اس نے کمر کو ایک فوجی جھٹکا دیا اور ماہر بیرے کی طرح بولا: "تھینک یو سر۔"

نہایت ہلکی سمر کا سوٹ پہن کر اختر نے پن پاکٹ میں سرخ رومال نکالا کالر کے ساتھ کارنیشن کا پھول لگایا اور کمرے کو بند کئے بغیر برآمدے میں چلا گیا۔ ہوٹل کا جمعدار سرخ قالین پر برش پھیر رہا تھا۔ اور آخری کونے سے ایک یورپین جوڑا جلدی جلدی باتیں کرتا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے عورت نے اس کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری۔ اور مسکرا کر بولی: "گڈ مارننگ۔"

اختر نے آنکھ کا جواب آنکھ سے دیا۔ اور اطالوی میں بولا۔



"بون جورنو مادام!"

جوڑا ایک دم رک گیا۔ مرد نے ہاتھ بڑھا کر اپنا اور بیوی کا تعارف کرایا۔ اور پھر وہ دونوں ہاتھ ہلاتے آگے بڑھ گئے۔

اختر کا قد، رنگت لباس، چال، ڈھال ہر جگہ اس کے لئے پاسپورٹ کا کام دیتے تھے۔

جب اختر لفٹ میں سے اترا تو وہ چند خاکی لفافے ہاتھ میں لئے لفٹ کے انتظار میں کھڑی تھی۔ آج اس نے لٹھے کی شلوار، پیازی قمیض اور ململ کا چنا ہوا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ اختر جلدی سے لفٹ میں سے اترا اور اس کے لفافوں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا: "نمسکار مشرقی پاکستان۔"

"وعلیکم السلام۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا اور پھر لفٹ کی طرف بڑھنے لگی۔

"صوفیہ کے لفافوں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے اختر نے کہا۔" آج تو میری ہم وطن میری ہم قوم بھی نظر آ رہی ہے۔"

"پہلے دو قوموں کے فلسفے نے پاکستان عطا کیا۔ اب آپ کی ہم قومیت کا فلسفہ خدا جانے کیا رنگ لائے گا۔"

اختر بالکل اس کے برابر ہو گیا اور لفافوں کے لئے ہاتھ پھیلا کر بولا: "ہم قومیت کا فلسفہ تو بس ایک ہی چیز عنایت کر سکتا ہے۔ مس رضیۃ الدین یکا نگت اور یک جہتی۔"

وہ جلدی سے لفٹ میں سوار ہو گئی اور اس کی طرف پشت کر کے بولی۔

"جی نہیں شکریہ۔ میں لفافے بازار سے لے آئی ہوں۔ تو کمرے تک بھی لے جاؤں گی۔ بہرکیف آپ کی یہ کوشش بھی ناکامیاب رہی۔"

پھر مکئی کے دانے چٹخنے کی آواز آئی۔ ایک ننھا سا قہقہہ لفٹ کے دروازے

کے ساتھ ٹکرایا اور اس کی نظروں سے لمبی سی چوٹی اور دوپٹے کے بل کھاتے ہوئے دونوں پلو غائب ہو گئے۔ اس نے سونے کے سگریٹ کیس میں سے سگریٹ نکالا اور زیرِ لب کہا: "HANG. IT ALL" پھر وہ ہوٹل کے صدر دروازے سے نکلا اور ٹیکسی میں بیٹھ کر شہر چلا گیا۔

جب وہ واپس ہوٹل میں پہنچا تو شام آ رہی تھی۔ سڑکوں کا ٹریفک بڑھ چکا تھا اور کہیں کہیں بتیاں بھی روشن ہو چکی تھیں۔ اس نے ٹیکسی سے اتر کر بیس روپے ٹیکسی والے کو دیئے اور پھر لمبے لمبے قدم دھرتا صدر دروازے کی طرف بڑھا۔ پام کے گملوں کے پاس ہوٹل کا دربان بیٹھا تھا۔ اس نے دیکھتے ہی اٹھ کر سلام کیا۔ نہایت خندہ پیشانی سے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اختر نے پتلون کی جیب میں سے کچھ ریزگاری نکالی اور بغیر گنے اسے دربان کے سپرد کر کے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ گہرے اور سیاہ موزیک کی سیڑھیوں پر سرخ قالین بچھا تھا اور ریلنگ پر چمکدار پالش شام کی روشنیوں میں اور بھی زیادہ پھسلنی اور آبدار نظر آ رہی تھی۔ آخری سیڑھی پر قدم دھر کر اپنے ہی سے کہا: "آج کا دن بھی رائیگاں گیا۔ بغیر کسی لطف کے، بغیر کسی EXCITMENT کے۔"

اس کے کمرے سے ذرا ہٹ کر ایک یورپین لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے بال پٹ سن کی طرح چمکدار اور گندم کی طرح زرد تھے۔ اس نے تمام بالوں کو سر کے پیچھے اکٹھا کر کے سرخ رومال باندھ رکھا تھا۔ سکرٹ میں سرخ اور سبز دھاریاں تھیں اور بلاؤز کا رنگ گہرا سبز تھا۔ وہ کمروں کے نمبر پڑھتی ہوئی اس کے کمرے پر آ کر رک گئی۔ اختر اس کے قریب پہنچا، اور دروازہ تھوڑا سا کھول کر انگریزی میں بولا۔

"یہاں میں رہتا ہوں۔ فرمایئے کچھ آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟"

لڑکی نے اتنی شام گئے بھی آنکھوں پر سیاہ چشمے لگا رکھے تھے۔ اختر کا جملہ سن کر



اس نے اپنی عینکیں اتاریں اور انگریزی میں گویا ہوئی: "مجھے مس ربیع الدین سے ملنا ہے۔ انہوں نے مجھے اپنا کمرہ بتایا تھا۔ لیکن میں بھول گئی ہوں۔ شاید انیس نمبر ہے۔ کیونکہ نو نمبر میں تو آپ رہتے ہیں۔"

اختر مسکرا کر بولا: "جی ہاں وہ انیس نمبر میں رہتی ہیں چلئے میں آپ کو ان کا کمرہ دکھا دوں۔"

یورپین لڑکی کچھ زیادہ لمبی نہ تھی۔ ذرا سی بات پر نہایت سادگی سے مسکرا دیتی اور بے باکی سے پوچھتی: "واقعی؟"

اختر نے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ آہستہ . . . . . . سے پھر اس لڑکی سے مخاطب ہوا: "مس ربیع الدین میری دوست ہیں۔"

"اچھا ہی ہوا، مجھے آپ مل گئے۔ ورنہ یونہی ڈھونڈنے میں کوفت ہوتی۔"

"اور کزن بھی ہیں۔" اختر نے رشتہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"واقعی؟ لیکن وہ تو مشرقی پاکستان کی ہیں اور آپ مغربی علاقے کے لگتے ہیں۔"

اختر نے مسکرا کر جواب دیا: "ملک تو ایک ہی ہے نا۔ آپس میں شادیاں وغیرہ ہوتی رہتی ہیں۔"

اس بار اختر نے ذرا اونچی سی دستک دی۔ لیکن اندر سے جواب نہ ملا۔ تو اس نے ذرا سا دروازہ اندر کی طرف دھکیل کر آواز دی: "مس ربیع الدین، مس ربیع الدین۔"

جب اندر سے خاموشی نے صدائے بازگشت دی تو سبز بلاؤز والی نے پوچھا۔

"کیا آپ کے ہاں کزن ایک دوسرے کو اپنے کرسچین نام سے نہیں بلاتے؟"

"جی ہاں ــــــ بلاتے ہیں۔"

"لیکن ابھی تو آپ نے انہیں مس ربیع الدین کہہ کر بلایا تھا۔" اس نے نیلی

آنکھیں کھول کر پوچھا۔

"صوفیہ مجھ سے کچھ خفا ہے۔ اس لئے۔"

اس بار پھر اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کئی بار سر ہلایا۔

"میرا خیال ہے آپ میرے ساتھ چلیں وہ چائے پینے ڈائننگ ہال میں گئی ہو گی۔" اختر نے اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

پھر وہ دونوں ساتھ ساتھ سرخ قالین پر ڈائننگ روم کی طرف چلنے لگے۔

اختر اس سے ذرا پیچھے تھا۔ اور وہ پلٹ پلٹ کر اس سے باتیں کرتی چلی جا رہی تھی۔

"دو دن سے ہم ایمبیسی میں مل رہی ہیں۔ آپ کی کزن بڑی دلفریب ہے۔"

اختر کا دل زور سے دھڑکا۔ اور اس دھڑکن پر اسے سب سے زیادہ خود تعجب ہوا۔

جواباً وہ بولا۔ "جی ہاں —— نہایت"

"ہم دونوں ہم سفر بھی ہوں گی۔ میں واپس اطالیہ جا رہی ہوں۔" سنہری بالوں کا گچھا ہوا ہوا ہل رہا تھا۔

"کب؟"

"یہی آپ کی کزن کے ساتھ۔ ایک ہی ہوائی جہاز میں سفر ہو گا۔"

"واقعی؟ ——"

"واقعی؟" وہ ہنس کر بولی۔ اس کی ہنسی جیسے چھوت کی بیماری تھی۔ اختر بھی خوامخواہ ہنس دیا۔

ڈائننگ ہال میں بہت گہما گہمی تھی۔ اور اگر اختر اس قدر لمبا نہ ہوتا تو اسے کونے میں چھپی ہوئی صوفیہ کبھی نظر نہ آتی۔ میزوں کے درمیان میں سے خوامخواہ معافیاں مانگتا راستہ بناتا اور اطالوی لڑکی کو راہ دکھاتا وہ سفید دوپٹے والی کے پاس پہنچا۔



صوفیہ کو دیکھتے ہی سبز بلاؤز والی کی ساری جھجک اور کم گوئی کا بند ٹوٹ گیا۔ اس کی آواز ذرا اونچی ہو گئی۔ اور وہ ہاتھوں کا اشارہ کر کے بولی۔

"صوفیہ اگر تمہارے کزن مجھے نہ ملتے۔ تو بخدا میں تمہیں ڈھونڈھ ہی نہ سکتی۔"

صوفیہ نے سر اٹھا کر اختر کی طرف دیکھا اور پھر اردو میں بولی۔ "واقعی تم ذہین ہو۔"

"اس ذہانت کے بدلے میں بیٹھ جاؤں؟" اختر نے پوچھا۔

"کزن پوچھ کر نہیں بیٹھا کرتے۔" صوفیہ بولی۔

اطالوی لڑکی نے اپنا ننھا سا پرس پیالی پرچوں کے ساتھ ڈال دیا اور جوش سے بولی۔ "ابھی تک ان کے نام سے ناواقف ہوں۔ میرا نام۔ آنا ہے۔ آنا۔"

صوفیہ نے اختر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اختر...... اختر علی خاں باقی جو کچھ پوچھے خود بتا دینا۔ کیوں میں اس سے زیادہ نہیں جانتی۔"

"یہیں کراچی میں رہتے ہیں کہ ڈھاکہ میں؟" آنا نے صوفیہ سے پوچھا۔

"جی نہیں لاہور میں رہتا ہوں۔ وہاں ہمارا کاغذ کا کاروبار چلتا ہے۔"

"واقعی؟ یہ انڈسٹری تو بہت پیسہ دلاتی ہے۔" اس نے کہا۔

"جی ہاں۔" اور پھر وہ اردو میں صوفیہ سے مخاطب ہوا۔ "اور یہ بھی بتا دو کہ ہم سے بڑا کاغذ کا بلیک مارکیٹر سارے پاکستان میں کوئی نہیں ہے۔ ایک لین دین میں ہزاروں کما لیتے ہیں۔"

صوفیہ کا چہرہ یکدم زرد پڑ گیا۔ اس نے زیر لب جلدی سے کہا۔ "اوّل تو بلیک مارکیٹر ہونا کوئی ایسی قابل ستائش چیز نہیں ہے۔ اور پھر اپنی اس کمزوری کا اعتراف کسی غیر ملکی کے سامنے کرنا تو انتہا کی حماقت ہے۔ انتہا کی۔"

اختر کی ساری خوشی اور شوخی ماند پڑ گئی۔ جس طبقے میں وہ رہتا تھا۔ وہاں

فخر سے لوگ اپنے بلیک مارکیٹیے ہونے کا ذکر کرتے تھے۔ وہاں بلیک مارکیٹ کرنا ذہانت کے مترادف تھا۔ عقل مندی کے ہم معنی تھا۔ پہلی مرتبہ اسے ذرا سی شرمندگی ہوئی۔ بالکل جس طرح صوفیہ نے جب وقتی ٹپ دی تھی۔ تو اس کے کان جلنے لگے تھے۔ اب بھی لہو اس کے کانوں کی طرف چڑھنے لگا۔

آنا نے صوفیہ کی طرف دیکھا اور پھر اختر پر نظر ڈالتی ہوئی بولی "کمال ہے تم دونوں ایک زبان بولتے ہو، حالانکہ یہ لاہور میں رہتے ہیں اور تم ڈھاکہ میں"

"لیکن ملک تو ایک ہے نا" صوفیہ بولی۔

آنا نے کہا "پھر بھی سنا ہے کہ کچھ زبان وغیرہ کا جھگڑا ہے"

اختر نے بیرے کو اشارے سے بلاتے ہوئے کہا "آنا میری پیاری اطالوی لڑکی یہ جھگڑا ویسا ہی ہے جیسا کہ نزہیں ہوتا ہے۔ فرد عی ۔۔۔ ۔۔ بھلا کبھی ہم وطنوں کو ایک دوسرے کی بات سمجھنا بھی مشکل ہوتی ہے"

"واقعی، واقعی"

"بھلا تم بتاؤ، کیا نیویارک والے جنوبی امریکہ والوں کی بات نہیں سمجھتے" اختر نے سوال کیا۔

"خوب سمجھتے ہیں، سمجھتے کیوں نہیں، میں خود شمالی اطالیہ کی ہوں۔ لیکن جنوب والوں کی بات خوب سمجھتی ہوں"

"بالکل اسی طرح بنگالی اور اردو میں صرف لہجے کا فرق ہے۔ صرف لہجے کا"

اس بار پھر اس نے بات کو نہ سمجھ کر بار بار سر ہلایا۔

بیرے کو کافی کا آرڈر دے چکنے کے بعد اختر نے صوفیہ سے کہا "لیکن آپ کی اردو واقعی بہت منجھی ہوئی ہے۔ اتنی مہارت آپ نے کہاں سے حاصل کی؟"

چائے کی پیالی منہ سے لگا کر وہ بولی "وہیں سے جہاں سے آپ نے بنگالی



کا لب و لہجہ سیکھا تھا"

سارے ہال میں ہلکی ہلکی باتیں اور پیالی پرچوں کے بجنے کا شور تھا۔ ابھی شام کا میوزک شروع نہ ہوا تھا۔ اور پیانو والا اپنے پیانو کو رومال سے جھاڑ رہا تھا سارے ہال میں بدیسی سینٹ اور کیک پیسٹری کی ملی جلی خوشبو پھیلی تھی۔ سفید دوپٹے والی نے ایک بازو ساتھ والی کرسی کی پشت پر ڈال رکھا تھا۔ ہوٹل کی تیز روشنیوں میں اس کی سیاہ آنکھیں نہایت کشادہ اور براؤن نظر آرہی تھیں اس کی لمبی چوٹی دائیں کندھے سے ہو کر اس کی گود میں دھری تھی اور ننھے ننھے پیر انگوٹھے والی سلیپروں میں سے جھانک رہے تھے۔

بیرے نے نہایت مؤدب انداز میں چائے کے تمام برتن اٹھائے اور ان کی جگہ کافی لگا دی۔ ننھی ننھی پیالیوں میں چینی ڈالتے ہوئے اختر نے آنا سے پوچھا۔

"کتنی شکر آنا"

"ایک چمچ۔ شکریہ"

"آپ کے لئے صوفیہ" اس نے آہستہ سے اس کے بازو کو چھو کر پوچھا بازو دریائے برہم پتر کے پانیوں کی طرح سرد تھا۔

صوفیہ نے بازو کرسی کی پشت سے اٹھا کر گود میں دھر لیا۔ اور آہستہ سے بولی۔

"جی نہیں"

"کیسی بغیر چینی کے کافی پیئو گی۔ اس قدر شوآف نہ کرو" اختر نے اردو میں کہا۔

صوفیہ مسکرا کر بولی "جی نہیں میں کافی نہیں پیوں گی۔ میں کافی پیتی ہی نہیں"

اختر نے ایک ہاتھ میں کافی دان اور دوسرے میں دودھ کا جگ اٹھا لیا۔ اور پیالی میں آنا کے لئے کافی ملا کر بولا "دیکھو صوفیہ اول تو کافی نہ پینا کوئی ایسی قابل ستائش چیز نہیں ہے اور پھر اس چیز کا اعتراف غیر ملکیوں کے سامنے تو حماقت

ہے۔ انتہا کی حماقت۔"

"کیا کافی نہ پینے سے ہمارے ملک کی شان کم ہو جائے گی؟" صوفیہ سے پوچھا۔

"بالکل۔ یہ لوگ تو پہلے ہی ہمیں وحشی سمجھتے ہیں۔"

"تو پھر بنا دیجئے۔ لیکن شکر دو چمچے ڈالئے گا۔ شکریہ۔"

ابھی وہ تینوں بیٹھے کافی پی رہے تھے کہ باہر کھلنے والی کھڑکیوں پر گہری شام کے سائے پڑ گئے۔ جگمگاتی سڑکوں کی روشنیاں اور سڑک پر آنے جانے والی ٹریفک اور بھی بڑھ گئی۔ ہوٹل میں موسیقی بہم پہنچانے والے سازندے اپنی اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ چکے تھے اور ایک نہایت اداس دُھن بجا رہے تھے۔ سارے ہال پر غروب آفتاب کی الوداعی خاموشی آپ سے آپ طاری ہو گئی تھی۔ صوفیہ بہت چپ تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ گود میں ڈال رکھے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کہیں بہت دور جا چکی ہے۔

آنا نے آہستہ سے پوچھا "یہ گانا جانتے ہو؟"

"سنا تو ہے لیکن الفاظ اب یاد نہیں آ رہے۔"

اس نے اپنے ننھے پرس کو ہاتھوں میں اٹھا لیا اور بولی "اس کے بول ہیں۔ تم پہاڑ کے اس جانب رہتے ہو۔ جہاں سورج چمکتا ہے۔ اور میں پہاڑ کے اس طرف رہتی ہوں جہاں ہمیشہ چھاؤں رہتی ہے۔ اب یاد آ گیا؟"

غیر شعوری طور پر اختر کی نظریں صوفیہ کی طرف اُٹھ گئیں۔ نیلی آنکھوں نے براؤن آنکھوں کو اپنی گرفت میں لینا چاہا اور پھر رسہ کشی میں اپنے آپ کو کمزور پا کر جھک گئیں۔

آنا اٹھتے ہوئے بولی "چلو صوفیہ چلیں۔ یہ بڑا گھٹا گھٹا ماحول ہے اور پھر ان کی موسیقی بھی ٹھیک نہیں۔ لوگوں کو قنوطیت کا سہارا نہیں لینا چاہیئے۔"

جب وہ تینوں اس جگہ پہنچے جہاں سے لفٹ نیچے جاتی تھی اور برآمدہ گردن



کی طرف نکلتا تھا۔ تو آنا نے کہا "آپ بھی ہمارے ساتھ چلئے اختر۔"

"کہاں؟"

"یعنی اگر آپ کا کوئی خاص پروگرام نہ ہو تو؟"

صوفیہ جلدی سے بولی "دیکھو آنا آج میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ اور مجھے خیال ہے کہ......"

"میں تمہیں اسپرو کھلاؤں گی۔ فوراً سر درد غائب ہو جائے گا۔"

"آج نہیں" صوفیہ نے ہچکچا کر کہا۔

"کیوں آج کیوں نہیں۔ آج ہی کا دن تو باقی ہے۔ کل تو میں اپنا سامان باندھ رہی ہوں۔ پھر نہ ٹیپ ریکارڈ ہو گا۔ نہ رنگین سلائیڈیں ہوں گی۔ کل تو ذرا بھی مزہ نہیں آئے گا۔"

اختر ریلنگ پر جھکتے ہوئے بولا "آنا دراصل یہ میری وجہ سے نہیں جاتیں۔ ہمارا جھگڑا ہو چکا ہے۔"

"جہاں دوستی ہوتی ہے جھگڑا لازمی رہتا ہے۔" اس نے ایک ہاتھ سے اختر کو پکڑا اور دوسرا بازو پھیلا کر صوفیہ کو اپنے قریب کرتے ہوئے بولی "مجھے تو تم دونوں کا معاملہ خراب نظر آتا ہے۔ چلو میرے گھر چلو۔ میں تم دونوں کی صلح کروا دوں گی واقعی۔"

اور وہ تینوں ہنستے ہوئے لفٹ میں سوار ہو گئے۔

بغیر بازوؤں والے سُرخ صوفے پر صوفیہ تنہا بیٹھی تھی۔ اور اختر ریڈیوگرام پر ریکارڈ بدل رہا تھا۔ ہاؤسنگ سوسائٹی میں ایک خوبصورت بنگلے کے آدھے حصے میں آنا رہتی تھی۔ اس کی چھوٹی سی لان کے سامنے پورچ میں زرد کار کھڑی تھی ابھی تک اختر کو وہ وقت یاد آ رہا تھا۔ جب ہوٹل کے سامنے آنا اپنی کار میں بیٹھی تھی۔ تو صوفیہ کے چہرے پر عجیب قسم کا تذبذب اور ہچکچاہٹ عیاں تھی۔ اپنے پاس بیٹ

کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنا نے کہا تھا۔ "دونوں آگے آجاؤ۔ بہت کافی جگہ ہے۔"

صوفیہ نے اختر کی طرف دیکھ کر پھر ہوٹل کی طرف دیکھا تھا۔ گویا اب بھی واپس جانے کا بہانہ تلاش کر رہی تھی۔ پھر جب اختر نے آگے بڑھ کر بائیں ہاتھ کا دروازہ کھول دیا تو وہ سمٹی ہوئی آنا کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اختر ان دونوں سے ہٹ کر کھڑکی کی طرف لگ کر بیٹھ گیا۔ انگوٹھے والی سلیپروں سے تنگ تو والے بوٹ بالکل فٹ بھر دور تھے۔

آنا نے اپنا پرس اور عینکیں صوفیہ کی گود میں پھینک دیں اور جھٹکے کے ساتھ کار روانہ کرتی ہوئی گانے لگی۔

"فار ہی از اے جولی گڈ فیلو۔"

اختر اپنی کانونٹ کی زندگی میں اس گیت کی رگ رگ سے واقف تھا اس نے اپنی آواز اٹھائی اور آنا کے ساتھ مل کر اونچے اونچے گانے لگا۔ صوفیہ کی نظریں اپنی گود میں پڑے ہوئے پرس پر جمی رہیں اور ایک بار بھی اختر کی جانب نہ اٹھیں۔ اختر کو محسوس ہوا وہ کہیں دور جا چکی تھی۔

صوفیہ گرے قالین پر اپنے سلیپروں والے پیر دھرے اکیلی لمبے صوفے پر بیٹھی تھی۔ بادامی اور سرخ پردوں پر ڈرائنگ روم کی بتیوں نے عجب جادو کر رکھا تھا۔ اور انہوں نے یہ جادو باقی کمرے کے فرنیچر پر منعکس کرنے کی ٹھان لی تھی۔

کمرے کے وسط میں شیشے کی لمبی میز پر کاک ٹیل کے تین گلاس دھرتے ہوئے آنا بولی۔ "آؤ آج اس نئی دوستی کا TOAST کریں۔"

شربتی رنگ کے ننھے ننھے کٹ گلاس آبگینوں میں ارغوانی آگ دم سادھے بیٹھی تھی۔ اختر کو اپنے حلق میں جلن سی محسوس ہوئی۔ کسی بچھڑے ہوئے ساتھی کو گلے لگانے کی تمنا بھی کو محسوس رہی تھی۔



اس نے گلاسوں کی تعریف کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "افسوس آنا میں شراب نہیں پیتا۔"

لمبے سرخ صوفے پر بیٹھی ہوئی لڑکی کو یکدم جنبش ہوئی۔ اس نے سیاہ آنکھیں اٹھائیں۔ اور نہایت تشکر آمیز نظروں سے اس کا شکریہ ادا کیا۔

"بہت مہنگی شراب ہے۔" آنا نے ترغیب دلاتے ہوئے کہا۔

"ایمان شراب سے بھی مہنگا ہوتا ہے۔ آنا!" اس نے محض صوفیہ کو موہنے کی خاطر کہا۔

"کیا معنی؟" آنا نے اپنا گلاس ہونٹوں سے لگا کر پوچھا۔

"ہمارے مذہب میں یہ شے حرام ہے۔"

"لیکن سبھی پیتے ہیں۔" اس نے خفیف ہو کر بات کی۔

"وہ لوگ نہ شراب کی قیمت جانتے ہیں نہ ایمان کی۔"

صوفیہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی طرف آگئی اور آہستہ سے بولی "اس وقت تو تمہارے دل پر آری چل رہی ہوگی۔"

"دل پر نہیں زبان پر۔ دل میں تو عجیب قسم کی خوشی ہو رہی ہے۔"

آنا کے ڈرائنگ روم میں ہر چیز نئی تھی۔ ہر چیز قیمتی تھی اور ہر چیز غیر ملکی لگتی تھی۔ موٹے گرے رنگ کے قالین پر تین صوفے تھے۔ بغیر بازو کے ان صوفوں کی پشت پر گہرا زرد اور سامنے والی سیٹوں پر بھڑکیلا سرخ کپڑا چڑھا تھا باہر برآمدے میں کھلنے والے دروازے کے دائیں جانب کی میز پر ٹیپ ریکارڈر اور بائیں طرف بڑا سا ریڈیوگرام تھا۔ عین کمرے کے وسط میں ایک خوبصورت شمعدان لٹک رہا تھا۔ جس میں اس وقت بجلی کے بلب روشن تھے۔ ان چیزوں کے علاوہ شیشے لگی نیچی الماری میں چند کتابیں اور البم تھے اور الماری کے اوپر ایک نازک سا گلدان تھا۔

جس میں گلاب کے تین سفید پھول بڑی ہنرمندی سے سجائے ہوئے تھے۔ جلنے والے دروازے کے ایک طرف پیانو دھرا تھا۔ اور دوسری طرف ایک چھوٹا سا دیوان تھا۔ جس پہ کئی فلمی رسالے گڈمڈ پڑے تھے۔ اسی دیوان کے اوپر ایک ہی قطار میں دیوار پہ پاکستان کے چند آرٹسٹوں کی کچھ تصویریں لٹک رہی تھیں اور پیانو کے اوپر مری اور ہزارے کی بنی ہوئی تین رنگین چنگیریں آویزاں تھیں۔

آنا اختر کی مدد سے درمیانی شیشے کی لمبی میز ایک طرف کرنے لگی۔ تو صوفیہ اٹھ کر کتابوں کی الماری کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔

اختر کو آنا نے حکم دیتے ہوئے کہا۔ "اختر تم یہ چھوٹا صوفہ پیچھے دھکیل دو۔ تو کافی جگہ نکل آئے گی۔ میں یہ کاک ٹیل کا ٹرے رکھ آؤں۔"

جب وہ ٹرے رکھ کر واپس آئی۔ تو گرے قالین پر کوئی چیز باقی نہ تھی اور تمام صوفے اور فرنیچر اختر نے دھکیل کر ساتھ لگا دیا تھا۔ صوفیہ کتابوں والی الماری کے پاس جھکی ہوئی کتابوں کے عنوان شیشوں میں سے پڑھ رہی تھی۔

آنا پاس آئی اور گلدان میں سے ایک سفید گلاب توڑا اور لمبی چوٹی کے سرے پر عین کان کے پیچھے ٹکا کر بولی "سادگی اور پھول ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ پاک مریم تمہیں نظر بد سے بچائے۔"

اختر ریڈیوگرام کے پاس بیٹھا والز کے ریکارڈ تلاش کر رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں کنول نینی کی طرف اٹھائیں۔ بالوں کی چوٹی سامنے لٹک رہی تھی۔ بائیں کان کے ساتھ ادھ کھلا گلاب یوں چمٹا ہوا تھا جیسے سرگوشیاں کر رہا ہو۔ یہ تصویر پتہ نہیں کیوں اس کے دل میں محفوظ ہو گئی۔ پھر اس نے جھک کر ایک سلو والز نکالا اور اسے ریڈیوگرام پر لگا دیا۔ آنا نے درمیانی شمعدان کا سوئچ بند کر دیا اور پیانو والی دیوار پر جلنے والے مدھم بلب کی روشنی اور بھی سحر انگیز ہو گئی۔



اختر اور آنا گرے قالین پر قدم سے قدم ملا کر ناچنے لگے۔

"تم بہت اچھا ناچتے ہو۔" آنا نے کہا۔

"تم مجھ سے اچھا ناچتی ہو۔" اختر بولا۔

بغیر ہیل والی جوتی پہنے آنا کے پاؤں بڑی آہستگی سے قالین پر پڑ رہے تھے۔ اختر کے لمبے لمبے بوٹوں کے مقابلے میں یہ پاؤں بہت چھوٹے نظر آ رہے تھے۔ جب صوفیہ کی طرف اختر کی پیٹھ ہوتی۔ تو صوفیہ کو آنا کا مرمریں ماتھا، اور گندم گوں چہرے کا کچھ حصہ نظر آتا۔ لیکن جب سرخ رومال سے بندھا ہوا بالوں کا گچھا اور دھاری دار سکرٹ والی کی پشت اس کی طرف ہوتی۔ تو اسے سنجیدگی سے گھورتی ہوئی دو نیلی نیلی آنکھیں نظر آتیں۔ سبز بلاؤز کی کمر پر ٹکا ہوا ایک مضبوط ہاتھ دکھائی دیتا اور وہ جلدی سے البم کے ورق الٹنے لگتی۔

جب اختر نے تیسرا ریکارڈ لگایا تو آنا سرخ صوفے کی طرف بڑھی۔ اور صوفیہ سے بولی "تمہارا کزن بہت POLISHED ہے ناچتا نہیں تیرتا ہے۔"

"اب تم ہمیں چھوڑ آؤ آنا۔" صوفیہ نے التجا کی۔

"ابھی سے؟"

"ہاں بہت دیر ہو گئی ہے۔"

"لیکن تمہارا کزن ساتھ ہے۔ تمہیں کاہے کا فکر ہے؟" آنا نے اپنے سرخ رومال کی گرہ درست کرتے ہوئے پوچھا۔

"میرے سر میں درد ہے۔ شدید۔"

"اسپرو سے افاقہ نہیں ہوا؟"

"نہیں۔"

"اچھا۔ میں ابھی ایک معجزہ نما دوائی لاتی ہوں۔" وہ اندر جاتی ہوئی بولی۔

"نہیں بھئی، اب بہت دیر ہو گئی ہے۔"

آنا نے اختر کو ریڈیو گرام بند کرنے کے لئے کہا اور صوفیہ سے بولی: "میں جانتی ہوں، تم بور ہو رہی ہو۔ آؤ اختر آؤ۔ مجھے ایک آئیڈیا سوجھا ہے۔ ایک زبردست IDEA۔"

اختر اس کے قریب آ گیا، تو اس نے کہا: "آؤ اپنے اپنے دیس کے گیت گائیں۔ میں تمہیں کیپری کا گیت سناؤں گی، تم مجھے اپنے اپنے دیس کے گیت سنانا۔"

اپنا سگرٹ گھماتی، بالوں کے گچھے کو پھڑکاتی وہ پیانو پر جا بیٹھی۔ پھر اس نے ایسے گانے سنائے، جن میں اس کے دیس کی باتیں تھیں، روم کی باتیں، اطالیہ کی باتیں۔

"پسند آیا۔"

"بہت زیادہ۔" صوفیہ پیانو کے ایک طرف کھڑی ہو کر بولی۔

"اب تم سناؤ صوفیہ۔" آنا نے اصرار کیا۔

"مجھے گانا نہیں آتا، سچ۔" صوفیہ نے پیچھے ہٹتے ہوئے بات کی۔

اختر نے دو چار پیانو کے نوٹ بجا کر کہا: "اب میری باری ہے۔ لیڈیز فرسٹ ہو چکی۔"

پھر اس نے کان پر ہاتھ دھر لیا۔ اور اونچے اونچے ماہیا گانے لگا۔ آنا ہنستی ہنستی قالین پر جا لیٹی۔ اور صوفیہ مسکراتی ہوئی پیانو کی تپائی پر بیٹھ گئی۔ ابھی دو بند ہی گزرے تھے، کہ ہاتھوں کے اشارے سے آنا نے اسے رُکنے کو کہا اور بولی: "بس بند کرو۔ تمہاری آواز گانے کے لئے موزوں نہیں۔ مجھے بُرے بُرے خواب آئیں گے۔"

اختر نے پیانو پر کہنی ٹکا لی اور صوفیہ سے کہنے لگا: "مشرقی پاکستان تو گیت اور نغمے کا دیس ہے۔ اس کی تو ہوائیں گاتی ہیں۔ دریا گاتے ہیں پھر تم کیوں



نہیں گاتیں۔ کیا تم اپنے نغمے اپنے تک محدود رکھنا چاہتی ہو؟"

صوفیہ نے آہستہ آہستہ پیانو کے سُروں کو انگلیوں سے محسوس کیا۔ یہ نغمہ دریاؤں پرے بہتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ پھر ان سُروں میں سے ایک مدھم سی دُھن نکلی اور سر جھکا کر صوفیہ گانے لگی۔ جن پانیوں پر صوفیہ پلی تھی۔ یہ راگ ان پہاڑوں میں صدائے بازگشت بن کر گھوم رہا تھا۔ جو صوفیہ کا وطن تھا۔ اس گیت میں وہ دھرتی تھی۔ جس کی آغوش میں صوفیہ بڑی ہوئی تھی۔ جہاں اس نے پڑھنا سیکھا تھا جہاں وہ اب پڑھاتی تھی۔

گیت ختم ہو چکا تھا۔ لیکن آنا ابھی تک قالین پر اوندھی لیٹی تھی۔ اس کا سگرٹ پنڈلیوں سے ہو کر ادھر ادھر پھیلا تھا اور سنہری بالوں کی سُرخ گرہ ڈھیلی ہو کر نیچے کی طرف پھیل آئی تھی۔ آنا اس قدر خاموش تھی کہ احساس ہوتا وہ یہاں موجود نہیں۔ گانے کے اولین بولوں پر اس نے پَیر ہلا ہلا کر تال قائم کی تھی لیکن پھر ہولے ہولے اس کا جسم ساکت ہو کر منجمد ہو گیا اور وہ جانے کہاں پہنچ چکی تھی۔

اختر کی نگاہیں ان پھول پر جمی تھیں۔ جو لمبی سی چوٹی کے سرے پر لگا تھا۔ آج سے پہلے اگر کوئی اسے کہتا کہ فلاں لڑکی کے لمبے بال ہیں۔ تو وہ فوراً کہتا۔ کٹوا دو۔ صورت نکل آئے گی۔ اسے اچھی طرح سے وہ دن یاد آ رہا تھا جب وہ خالدہ کے بال کٹوانے گیا تھا۔ خالدہ کے بال براؤن اور ذرا لمبے سے تھے اور وہ ان کی غور و پرداخت پر کئی گھنٹے صرف کرتی تھی۔ گھر سے باربر کی شاپ تک ان دونوں میں مسلسل اسی بات پر بحث ہوتی رہی تھی۔ خالدہ تذبذب میں تھی۔ کبھی وہ جدید فیشن کے چھوٹے چھوٹے بال کٹوانا چاہتی۔ اور کبھی وہ کہتی۔

"نہیں اختر۔ ذرا اونچا سا جوڑا گردن کے سرے پر باندھوں گی۔ تو بہت سمارٹ لگوں گی۔"

اختر نے بالآخر تنگ آکر کہا: "اچھا خالدہ نہ کٹواؤ بال لیکن اس کے بعد میں تمہارے ساتھ کہیں باہر نہ جاؤں گا۔"

"کیوں؟" خالدہ نے پوچھا۔

"بس میں مائی حوا کے ساتھ پھرنا پسند نہیں کرتا۔"

اور تو اور پیچی کے بال کٹوانے کا سہرہ بھی اختر ہی کے سر بندھتا تھا۔ نہ تو ان کے بال لمبے تھے۔ اور نہ ہی انہیں کٹے ہوئے بالوں پر اعتراض تھا۔ وہ تو بس بار بار کہتیں۔ بھئی ملنے والیاں کیا کہیں گی۔

ان کے اس اعتراض پر ہر بار اختر کہتا: "آپ کو ملنے والیوں کے جذبات کا زیادہ احترام ہے کیا؟"

اور جب پیچی باتیٹرو جن اور مہندی لگے سرخ اور سنہری بال کٹوا کر دکان سے نکلیں تو اختر ان کے کندھے پر خوشی سے ہاتھ مار کر بولا: "بات ہوئی نا۔ اب آپ ہماری ممی لگتی ہیں سولہ آنے۔ دیکھئے ایک زمانہ جلے گا ایک زمانہ۔"

اس وقت اس کی نگاہیں صوفیہ کی گود میں پڑی ہوئی چوٹی سے کر بار بار پھول ٹک جاتی تھیں اور اسے الجھن ہو رہی تھی۔ بار بار وہ جی میں سوچتا شاید اگر صوفیہ بال کٹوا دے تو یہ ہلکی سی خلش یہ الجھن جو میں محسوس کر رہا ہوں جاتی رہے اس کے یہ لمبے بال ہیں جو مجھے اس کے متعلق سوچنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ اور تو اس لڑکی میں کوئی بات نہیں ہے رنگ سانولا ہے۔ قد چھوٹا ہے ناک لمبی اور آگے کو بڑھی ہوئی ہے لیکن آنکھیں، خیر ایسی آنکھیں LIFELESS ہوتی ہیں۔ بڑی بڑی اور۔۔۔ ۔۔۔ اور پھر صوفیہ نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا اور گیت کی تان اونچی ہو گئی۔ اس کے دل میں کسی نے پوچھا کیا واقعی یہ آنکھیں LIFE LESS ہیں۔ واقعی۔ جی سے کہہ رہے ہو؟



گیت کے بول ہولے ہولے کمرے میں طواف کرنے لگے۔ انہوں نے آنا کے سگرٹ پر جال پھیلا دیا۔ اس کے بالوں میں جالے بننے لگے۔ بجھی ہوئی شمعدان میں جا گھسے اور چھت سے ٹکرا ٹکرا کر اختر کی طرف لوٹنے لگے۔ یہ گیت ان گانوں سے بہت مختلف تھا۔ جسے سننے کی اُسے عادت تھی۔ جس کی تال پر وہ خالدہ کو بانہوں میں لے کر ناچا کرتا تھا۔ اس گیت میں زندگی کا کرب تشنگی اور بے ساختہ کھینچ تھی۔ جو اس کے لئے بالکل نئی چیز تھی۔ سارا کمرہ مایوسی میں ڈوبا ہوا تھا۔ گیت تنہا تھا بالکل تنہا۔ اور صوفیہ اکیلی بیٹھی تھی اس کے ہاتھ یوں پیانو پر رواں تھے جیسے کوئی اندھا اپنی محبوبہ کو ہاتھوں سے محسوس کر رہا ہو اور اس کی آواز تھی کہ شعلے کی طرح لپکتی جا رہی تھی۔ بھڑکتی جا رہی تھی۔

پھر صوفیہ خاموش ہو گئی۔ پیانو کے سُر چپ ہو گئے۔ اور کمرے میں گانے کی صدائے بازگشت چراغ کا دھواں بن کر پھیل گئی۔ وہ تینوں خاموشی سے اٹھے اور باہر آکر کار میں بیٹھ گئے۔ آنا نے ایک دھچکے سے کار سٹارٹ کی اس کا سرخ رومال قالین پر رہ چکا تھا۔ اور سن جیسے بال کندھے پر کھلے تھے۔ صوفیہ کے بالوں کا پھول ذرا سا ایک طرف کو جھک آیا تھا اور اس میں شام والی تازگی باقی نہ رہی تھی۔ وہ تینوں خاموش تھے۔

پھر کار کو دھچکے لگاتی ٹریفک سے بچاتی صوفیہ نے پوچھا: "وہ گیت جو تم نے گایا تھا صوفیہ۔ اس کے کیا معنی تھے۔ مجھے یہ گیت ضرور سکھا دو۔ میں روم جا کر سینٹ پیٹر کے آگے اسے گاؤں گی۔ وہاں بہت کبوتر رہتے ہیں۔ میرا گانا سن کر وہ میرے ارد گرد اکٹھے ہو جائیں گے اور میں تمہیں یاد کروں گی۔ اس شام کو یاد کروں گی۔"

صوفیہ گیت کا ترجمہ کرنے لگی۔ پہلے وہ بنگالی کے بول دوہراتی پھر انگریزی میں ان کا مفہوم بیان کرتی۔ اس وقت اس کی آواز میں گیت سے بھی زیادہ ترنم تھا۔

یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنی کلاس میں ننھے ننھے بچوں کو مسحور کرنے کہانی سنا رہی ہو بچوں کے منہ کھلے ہیں ان کی آنکھوں میں ایک انجان دیس کی ان دیکھی فضا ہے اس دیس میں چلنے والی ہواؤں کا سحر ہے۔ اور وہ طلسمات ہیں، جو صرف خوابوں میں پورے ہوا کرتے ہیں۔

صوفیہ ہولے ہولے.. .. ..انگریزی میں کہہ رہی تھی۔

"آتا یہ گیت قاضی نذرالاسلام نے لکھا ہے اور سنہری لڑکی کے متعلق ہے، شاعر کہتا ہے۔:

"میری کشتی کس سنہری بستی کی طرف رواں دواں ہے ہوا موافق ہے پھر بھی مخالف سمت میں بسنے والے سنہری گاؤں کی طرف یہ کیوں کھینچی چلی جا رہی ہے کیا یہ بھی کسی پر عاشق تو نہیں ہو گئی۔ میری کشتی شکستہ ہے۔ لیکن اب مجھے کسی شے کا ڈر نہیں۔ اب میں نے دردِ محبت کا سہارا لے لیا ہے۔ وہی اب کھیون ہار ہوگا۔ اے میری محبوبہ تم کون ہو۔ کس دیس سے آئی ہو۔ کن خوابوں کی بسنے والی ہو۔ اور بھلا مجھے کیوں اشارے کرتی ہو۔ رات طوفانی ہے اور تم گھر کے دیئے بجھا کر مجھے کیوں بلا رہی ہو۔ اتنی کشش اور محبت کی تاثیر کا کس بل تم میں کہاں سے آیا۔ بتاؤ تم کون ہو اور میرا سہانا گیت سُن کر مجھ پر عقیدت کے پھول نچھاور کرنے کیوں آگئی ہو۔

میری کشتی ٹوٹ چکی ہے بھلا اس ٹوٹی کشتی کو کھے کھے کر تم کہاں لے جاؤ گی۔ کیا اپنے سنہری دیس میں اس چاہنے والے کو لے جانے کا ارادہ رکھتی ہو۔"

اختر کے کان میں ترجمے کے آخری بول ہولے ہولے بج رہے تھے۔ کھنک رہے تھے۔ ناچ رہے تھے۔ کوئی بہت قریب بیٹھا ہوا پوچھ رہا تھا۔



میری کشتی ٹوٹ چکی ہے۔ بھلا اس ٹوٹی کشتی کو کھے کھے کر تم کہاں لے جاؤ گی۔

جانِ تمنا۔ کیا تم اپنے سنہرے دیس میں اس چاہنے والے کو لے جانے کا ارادہ رکھتی ہو۔

جانِ تمنا۔ کیا تم اپنے سنہرے دیس میں اس چاہنے والے کو لے جانے کا ارادہ رکھتی ہو۔

جانِ تمنا۔ کیا تم اپنے سنہرے دیس میں اس چاہنے والے کو لے جانے کا ارادہ رکھتی ہو۔

ایک ہتھوڑی تھی کہ مسلسل اس کے ذہن کو کوٹ رہی تھی۔ آتا کار چلا رہی تھی اور اختر منہ کھولے سوچ رہا تھا۔ کہ یہ سامنے کھلی سڑک نہیں ہولے ہولے چلنے والا کھلا سا دریا ہے۔ اس پر میری کشتی رواں دواں ہے۔ کشتی کا بادبان کھلا ہے اور اس میں پُروا کے جھونکے بھرے ہیں۔ ڈوبنے والے چاند کی ساری کرنیں وہ دریا کی سطح نے چاٹ لی ہیں اور اب اس کی لہر لہر میں پارہ دہک رہا ہے گھاٹ پر مجھ سے بہت دُور سفید ساڑھی پہنے ہاتھ میں دیا لئے ایک لڑکی کھڑی ہے جب پتوار پانی کی سطح کو چھوتا ہے۔ تو گھاٹ کی اس جانب سے ایک ہلکی سی صدا آتی ہے جیسے کوئی شعلہ سا لپک رہا ہو۔ جیسے کوئی گیت کے بادبان باندھ کر اسے لینے آ رہا ہو۔ چاندنی کا سارا پارہ دریا نے پی لیا ہے۔ کشتی کے بادبان میں ساری پُروا بس گئی ہے۔ اور پتوار لہک لہک کر ڈوبتا ہے ابھرتا ہے اور لحظہ بہ لحظہ وہ سفید ساڑھی، وہ لپکتا شعلہ، وہ جلتا دیا قریب آ رہا ہے۔ قریب آ رہا ہے۔

پوری بریک لگا کر بڑے زبردست دھچکے کے ساتھ آتا نے کار روکی۔ صوفیہ کا سر سیٹ سے ٹکرا گیا۔ اور گھاٹ پر کھڑی لڑکی دریا میں غوطہ لگا گئی۔ اختر باہر نکلا اور اپنی عادت کے مطابق مہذب مردوں کی طرح اس نے صوفیہ کو سہارا دے کر

باہر نکالنے کے لئے بانہہ پیش کی۔ لیکن اس کی مدد کے بغیر سیٹ پر کھسک کر صوفیہ آگے آئی، انگوٹھے والی سلیپر میں ایک پیر اترا اور پھر وہ باہر آگئی۔

"تم کل ایمبسی آؤ گی، صوفیہ؟" آنا نے پوچھا۔

"پتہ نہیں؟"

"مجھے تو پاسپورٹ لینے جانا ہے۔ اچھا چاؤ۔ ۔۔ صوفیہ۔ چاؤ اختر؟"

"چاؤ آنا۔ چاؤ؟" اختر نے ہاتھ ہلا کر کہا۔

صوفیہ نے دوپٹے کا پلو ہلایا۔ اور پھر ہوٹل کی طرف مڑ گئی۔

خاموشی سے وہ دونوں لفٹ میں چڑھے اور اوپر آکر خاموشی سے ہی اتر گئے۔

برآمدے کے سرخ قالین پر چلتے ہوئے اختر اس سے دو قدم پیچھے تھا۔

پھر سفید گلاب اس کے بالوں سے کھسکا، کندھے پر گرا اور کھسکتا ہوا سرخ قالین پر جا پڑا۔

کمرہ نمبر انیس کے سامنے پہنچ کر صوفیہ نے بڑی خوش خلقی کے ساتھ کہا۔

"شب بخیر؟"

اختر نے سگرٹ سلگایا اور بڑی شوخی سے بولا "شب بخیر کزن؟"

انیس نمبر کمرے کا دروازہ بند ہوگیا۔ تو آہستہ آہستہ اختر اپنے کمرے کی طرف چلنے لگا۔ اُسے اپنی جذباتیت پر غصہ آرہا تھا۔ پہلی بار اس نے شراب جیسی چیز سے انکار کیا تھا۔

بھلا یہ بھی کوئی زندگی تھی، یہ بھی کوئی معیار تھا۔ پہلی بار اس نے شراب جیسی چیز سے انکار صرف ایک لڑکی کو دیکھ کر کیا۔

پھر چلتے چلتے وہ مڑا جھکا اور سرخ قالین پر گرا ہوا سفید پھول اس کی ہتھیلی میں ہولے سے اٹھ آیا۔ اس نے ہتھیلی بھینچ لی۔ اور اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر



اندر چلا گیا۔

خالدہ کا لفافہ سینٹ اور لوشنوں کے اوپر پڑا تھا۔ اس نے ندامت سے سوچا کہ صبح اسے پوسٹ کردوں گا۔

اختر نے گلاب کا پھول بیڈ لیمپ پر زور سے مارا اور تکیے میں منہ دیکر سو گیا۔

صبح خالدہ کا خط ملا، وہ اسی طرح مہک رہا تھا۔

اختر نے آرام کرسی پر نیم دراز ہوکر خوب صورت ہوائی پیڈ کا ورق آگے دھر لیا، لکھا تھا۔

اختر مائی ڈیئر!

تم نے اچھی مصیبت ڈال رکھی ہے۔ نہ ٹینس کھیلنے کو پارٹنر ملتا ہے نہ فلم دیکھنے کو ساتھی ملتا ہے۔ یہاں اتنی اچھی اچھی فلمیں لگی ہیں۔ لیکن امی کو نہ کام ہے اور ابا دفتر سے رات کو آتے ہیں۔

اچھا باقی باتوں سے پہلے میرا ایک کام سن لو۔ چلتے وقت بھی میں نے کہا تھا۔ کرنائی لیکس اب یہاں نہیں ملتی۔ یعنی یہ کہ بلیک مارکیٹ ریٹ پر بھی نہیں ملتی۔ میں اور امی کل علی برادرز گئے تھے۔ تو قسمیں کھانے لگا کہ سٹاک ختم ہوگیا ہے میرا خیال ہے بدبخت نئے REGINE سے ڈرتے ہیں۔ خیر آج ہی کان کھول کر سن لو۔ آج ہی بازار جاکر نائی لیکس خرید لینا نارنجی اور فیروزی رنگ بہتر ہیں۔ لیکن اگر یہ رنگ نہ ملتے ہوں تو پھر جو رنگ بہتر مل سکے ضرور لے آنا۔ قمیض کے لئے تین گز اور بلاؤز کے لئے ڈیڑھ گز یعنی کل ڈیڑھ گز نائی لیکس چاہیئے۔ لیکن خیال رہے رنگ مختلف ہوں ایک دوسرے سے!

اور ہاں ایک سکینڈل سنو۔ وہ اپنے ساتھ والی کوٹھی کی زرینہ ہے نا۔ وہی زرینہ واجد علی کل رات بدبخت نے خودکشی کرلی۔ مسز واجد علی تو کہتی ہے

کہ غلطی سے رات سانورل کی گولیاں زیادہ کھا گئی تھی۔ لیکن سب جانتے ہیں کہ بے وقوف نے پروفیسر منیر احمد کی خاطر جان دی ہے۔ اختر بھئی کیا زمانہ آگیا ہے اب لڑکیاں ماں باپ کو کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ اب شادی بیاہ بھی اپنی مرضی سے چاہیں گی بھلا ماں باپ جہاں شادی کریں گے کچھ دیکھ کر ہی کریں گے۔ کچھ سیکیورٹی ہوگی۔ کچھ لڑکے کا مستقبل ہوگا۔ مجھے تو اتنی دیدہ دلیری بخدا پسند نہیں۔ میں تو کہتی ہوں کہ مسز واجد علی نے غلطی کی۔

زرینہ کا بیاہ پروفیسر سے کر دیتیں۔ جب تین سو روپے میں گزارہ کرنا پڑتا آپی آپ ماں باپ کے گھر آ جاتی۔ لیکن بھئی مسز واجد علی پروفیسر سے بیاہ کیونکر کر دیتی اُن کے سٹینڈرڈ کا بھی ہوتا۔

اور سناؤ۔ کراچی کے موسم کا کیا حال ہے۔ یہاں تو اب شام کو کوٹ پہننا پڑتا ہے امی نے پرسوں مسز شیخ کے ڈِنر پر ذرا شوخی دکھائی تھی۔ اور بغیر کسی گرم کپڑے کے شفون کی ساڑھی پہن کر گئی تھیں۔ سو اب زکام سے پڑی ہیں ڈاکٹر راحت بیگ صبح آئے تھے تمہارا پوچھ رہے تھے: "وہ DANDY کہاں گیا۔ آج دوائیوں کے معاملے میں کوئی مشورہ دینے والا موجود نہیں۔" خوب قہقہہ پڑا۔

لو، زری کا فون آگیا۔ کم بخت اسی وقت فون کرتی ہے جب اس سے بات کرنے کو جی نہ چاہے۔ دیکھ لینا نوٹس مانگے گی۔ اور تم لکھ رکھو میری بات محترمہ اس بار بھی فائنل میں فیل ہوں گی۔ ہاں پچھلی رات مسز توصیف ملی تھیں۔ تمہارا بہت بہت پوچھ رہی تھیں۔

اچھا اب اجازت دو۔

تمہاری...
خالدہ



خالدہ کا خط پڑھ کر اختر نے لمبی انگڑائی لی۔ اس خط نے اس کی طبیعت پر دیسا ہی اثر کیا تھا۔ جیسے کسلمندی کے وقت فروٹ سالٹ پی کر جی بحال ہو جاتا ہے اس نے بڑے جوش اور شور کے ساتھ خالدہ کے خط کو بوسہ دیا۔ اور اونچے سے بولا۔

"ابھی جانِ من ابھی نائی ٹیکس لینے جاؤں گا۔ اور تو گز کی کیا شرط ہے سب رنگ خریدوں گا۔ جتنے بھی رنگ ملے۔"

گیارہ بج رہے تھے۔ اور آج پھر اس نے صبح ناشتہ نہ کیا تھا۔ بڑی دیر لگا کر اس نے غسل کیا۔ اور نہا دھو کر جب تیار ہو گیا۔ تو سلکی کوٹ کے کالر میں لگانے کے لئے اس نے اپنے گلدان سے ایک ننھا سا پھول توڑا۔ جب وہ اپنے بٹن ہول میں یہ پھول لگا رہا تھا۔ تو اس کی نظر بیڈ لیمپ کے نیچے میز پر پڑے ہوئے سفید گلاب کے پھول پر پڑی۔ گلاب مرجھا گیا تھا۔ اور اس کی سفید جلد پر براؤن چتیاں پڑ گئی تھیں۔ اختر نے بٹن ہول خالی رہنے دیا۔ اور بیڈ لیمپ کی طرف بڑھ گیا۔ پھر مسکرا مسکرا کر اس نے اس پھول کو میز پر پھینک دیا۔ اور اپنے بوٹوں پر رومال پھیرتے ہوئے کہا: "اب وہ صوفیہ کتنی مہمل لگتی ہے دراصل ساری خرابی اس خالدہ کی بچی کی ہے اگر پچھلے ماہ ہماری شادی ہو جاتی تو اب میرے یہ تین چار دن ضائع نہ ہوتے لیکن اس بے وقوف کی تو تیاریاں ہی پوری نہیں ہوتیں۔"

پینٹ کی ہپ پاکٹ میں سو سو کے بہت سے نوٹ ڈالنے کے بعد جب وہ کمرے میں سے نکلا تو اس کے ذہن سے گلاب کا پھول اور اس کی مالکہ کا خیال بالکل نکل چکا تھا۔ وہ سیٹی بجاتا ریلنگ پر ہاتھ رکھ کر جب ہوٹل کے نیچے پہنچا تو اسے خیال آیا۔ چلو صوفیہ کو بازار لے چلتا ہوں۔ کپڑا خریدنے میں آسانی ہوگی۔ بالکل دوستوں کی طرح۔ ہر گندہ خیال دل سے نکال کر۔

اٹھائیس نمبر کمرہ بند تھا۔ پھر سامنے سے وہی غیر ملکی جوڑا گزرا بہت چہک کر

مادام بولیں: "بون جور نو سینور۔"

مرد نے آگے ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا۔ اور پھر دونوں ہاتھ ہلاتے لفٹ کی طرف چل دیئے۔

اختر نے بہت آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔

"کون ہے؟" آواز آئی۔

"کزن۔"

اندر سے مکئی کے دانے چٹخنے کی آواز آئی۔

"اصلی کہ نقلی؟"

"اصلی۔" اختر نے دروازے کے ساتھ منہ لگا کر جواب دیا۔

صوفیہ نے دروازہ کھولا۔ تو سب سے پہلے اس کی نظر ساڑھی پر پڑی۔ آج صوفیہ سفید کپڑوں میں ملبوس نہ تھی۔ اس نے سبز رنگ کا بلاؤز پہن رکھا تھا۔ اور ہلکے زرد رنگ کی ساڑھی میں اس کا سانولا رنگ بہت پیلا دکھائی دے رہا تھا۔ کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں تھیں اور اس کے چہرے پر نئی بیاہی ہوئی لڑکیوں کا روپ تھا۔

"صوفیہ۔ ابھی مجھے اپنی کزن کا خط ملا ہے۔"

صوفیہ نے مسکرا کر پوچھا: "اصلی کہ نقلی؟"

"بدقسمتی سے یہ اصلی کزن کا خط ہے۔"

"پھر۔؟"

"اور محترمہ نے میرے ذمے ایک بوگس کام لگا دیا ہے۔"

وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"مجھے کچھ کپڑا خریدنا ہے۔ نائی لیکس۔ اگر تم ساتھ چلو، تو آسانی سے رنگ وغیرہ چن سکوں گا۔"



صوفیہ نے انکار میں سر ہلا کر کہا: "اول تو میں نے کبھی نائی لیکس نہیں خریدی میرا مشورہ فضول ہوگا۔ اور پھر ان دنوں میں بھلا ایسے کپڑے ملیں گے کہاں۔"

"ملنے ولنے کی بات آپ رہنے دیں۔" اس نے وثوق سے بات کی: "آپ ذرا چلنے کا تردد کیجئے۔"

"مجھے ایمبسی جانا تھا۔" اس نے عذر خواہی کی۔

"ایک تو مجھے اس ایمبسی سے چڑ ہو چلی ہے یا تو آپ چلیں ورنہ میں آپ کو اٹھا کر لے جاؤں گا۔"

وہ ہنس دی: "واقعی۔"

"جی ہاں۔ ذرا سا کام ہے سو وہ بھی آپ حق ہمسایہ ادا نہیں کر سکتیں۔"

وہ دونوں جب ٹیکسی میں بیٹھے اور بوری بازار کی طرف روانہ ہوئے تو صوفیہ نے آہستہ سے کہا: "معاف کیجئے۔ لیکن نائی لیکس پہننا کیا ضروری ہے۔ کسی ڈاکٹر نے مشورہ دیا ہے کیا؟"

"جہیز وغیرہ بن رہا ہے خالدہ کا اس کے لئے درکار ہے۔"

صوفیہ نے اپنے پرس کی ڈوریاں کھینچتے ہوئے کہا: "اختر صاحب مجھے حق تو نہیں پہنچتا لیکن معاف کیجئے ایک بات کہے بغیر میں رہ نہیں سکتی۔"

"کہیئے ضرور کہیئے کزن پر حق نہیں پہنچتا تو پھر کس پر پہنچے گا۔"

"میرا تو ضمیر گواہی نہیں دیتا کہ میں نائی لیکس کی خریداری میں آپ کی شرکت کروں۔ اور آپ میرے مشورے سے اسے خریدیں۔"

"وہ کیوں؟"

"بس جی بددیانتی ہے وطن کے ساتھ۔ اور تو کچھ نہیں۔" صوفیہ بولی: "خیر، خیر۔" اختر نے جواب دیا اور ٹیکسی کا دروازہ کھول دیا۔

وہ دونوں بازار میں اتر گئے۔

چھوٹی چھوٹی دکانوں میں پھرتے پھراتے انہیں گھنٹہ ہو گیا۔ چھوٹے چھوٹے لفافے اختر اور صوفیہ کے بازوؤں میں آ گئے لیکن ابھی تک نائی لیکس کا ایک انچ بھی نہ خریدا گیا تھا۔ کبھی وہ کراکری کی دکان پر جا ٹھہرتے اور چینی کے بنے ہوئے مرغے اور بلیاں دیکھتے کبھی چوراہے میں کھڑے نائیلان اور پلاسٹک کی سستی چیزیں بیچنے والوں کے پاس رک جاتے۔ انہوں نے وہ تمام چیزیں دیکھ ڈالیں جن کی انہیں ضرورت نہ تھی۔ لیکن ہر بار جب وہ کسی کپڑے کی دکان کے آگے رکتے تو صوفیہ کہتی۔

"چلو اگلی دکان سے پوچھ لینا یہ تو چھوٹی سی ہے۔"

جب وہ چوڑیوں اور سنگھار والوں کے پاس پہنچتے تو صوفیہ سستی کاسنی رنگ کی چوڑیاں پسند کر کے کہتی:

JUST FOR FUNS' SAKE

"اختر اپنی کزن کو یہ بھجوا دو۔ اسے نائی لیکس سے بھی زیادہ یہ عزیز ہوں گی۔"

اختر سر ہلا کر کہتا: "ایسے تو درجنوں ڈبے اس کے پاس بھرے پڑے ہیں۔"

پھر کسی کیوریو شاپ میں گھس کر صوفیہ کہتی: "یہاں سے کچھ پسند نہیں آیا اپنی کزن کے لئے۔"

جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔ اختر کا دل اسی طرح بے مصرف دکانوں میں پھرنے کی طرف مائل تھا۔ اور جب وہ گھومتے پھرتے شاہراہ پر آ نکلے تو اختر نے جی میں سوچا اب نائی لیکس کل خریدوں گا۔ اس لڑکی کے بغیر۔ اس وقت کہیں جا کر لنچ کھانا چاہیے صبح کا ناشتہ بھی نہ کیا تھا اور آنتیں بھوک سے بلبلا رہی تھیں۔

صوفیہ اس وقت سڑک کے آخری سرے پر پن والے کی دکان پر کھڑی سستے پن دیکھ رہی تھی۔ اختر نے اس کا کندھا تھپتھپا کر کہا: "چلو صوفیہ یہاں سے چینیوں کا ہوٹل قریب ہے وہاں چل کر کھانا کھاتے ہیں۔"



بارہ آنے دکاندار کو دے کر صوفیہ نے سیاہ پن اپنے بلاؤز میں ٹانکا اور بولی۔

"تو بہ مجھے تو ہوٹلوں میں کھانے والے سے دہشت ہوتی ہے۔"

"غضب کے SOUP بناتے ہیں یہ لوگ۔"

"گوشت سے مجھے ویسے بھی نفرت ہے۔" وہ منہ پھیرتے ہوئے کہنے لگی۔

"کبھی پٹھانوں کے ہاتھوں کے بنے ہوئے چپل کباب اور سیخی کباب کھاؤ۔ تو پچھلی جات ہمیشہ کے لئے بھول جاؤ۔"

وہ ہنسنے لگی۔

"بخدا مجھے غصہ آ رہا ہے۔ میرے ہاتھوں کے بنائے ہوئے کباب ہوں۔ تو تم انگلیاں بھی چاٹ کھاؤ ساتھ۔"

ہنستے ہنستے وہ بولی: "اچھا کا غذے پہلے کبابوں کی بلیک مارکیٹ کیا کرتے تھے کیا؟"

"مذاق نہیں بہت اچھے کباب بنا لیتا ہوں میں۔"

وہ پھر بھی ہنستی رہی۔

"چلو گھر چلتے ہیں۔ میں تمہیں کباب بنا کر کھلاؤں گا۔ مرچوں والے تیز تیز۔"

جب وہ دونوں فرائینگ پن قیمہ اور کباب میں ڈالنے والا تمام مصالحہ لے کر ہوٹل میں پہنچے تو لوگ لنچ کھانے ڈائننگ روم کی طرف جا رہے تھے۔ ساری کوری ڈور مہکی ہوئی تھی۔ مرد عورتوں کو یوں ساتھ ساتھ لے جا رہے تھے گویا کانچ کے آبگینے ہوں اور ہلکے سے لمس سے ٹوٹ جائیں گے۔ گو قیمہ، پیاز اور مصالحہ وغیرہ بڑے سے لفافے میں بند تھے اور یہ سارا سامان پلاسٹک کے تھیلے میں دھرا ہوا تھا۔ لیکن لوگوں کو لنچ کھانے کے لئے بڑھتا دیکھ کر اختر جی ہی جی میں کچھ شرمندہ ہو گیا۔ اس نے چور نگاہوں سے ایک بار پلاسٹک کے تھیلے پر نظر کی۔ اسے لگتا تھا

سب لوگ کچے قیمے کے وجود سے واقف ہیں، صوفیہ اپنے بنڈل سنبھالے بہت آگے آگے جا رہی تھی۔

اپنے بستر پر لفافے پھینک کر صوفیہ بولی "ابھی لنچ کا وقت ہے۔ چلو کھانا کھا لیں۔"

اختر نے کچھ اپنی ہیٹی محسوس کرتے ہوئے کہا: "ابھی کباب تیار ہو جائیں گے۔ دیکھ لینا تم۔"

قیمہ لفافے کے ساتھ چمٹ گیا تھا۔ چھری کے ساتھ اُسے علیحدہ کیا تو لفافہ جا بجا قیمے کے ساتھ ہی چمٹ کر رہ گیا۔ صوفیہ بولی: "لاؤ قیمہ دھلا دوں کاغذ آپ ہی اُتر جائے گا۔"

"نہیں، آج تم میری مہمان ہو۔ بالفاظ دیگر آج مشرقی پاکستان، مغربی پاکستان کا مہمان ہے۔ سارا کام میں خود کروں گا۔"

قیمہ دھو کر رکھنے کے بعد اختر نے پیاز چھیلنے شروع کیے۔ اس نے کبھی بچپن میں کباب پکتے دیکھے تھے۔ لیکن پیازوں کے قریب تو وہ صرف اسی وقت جاتا تھا جب وہ سلاد میں پیش کئے جاتے۔ ذرا سا پیاز کو ہاتھ لگا۔ تو اس کی آنکھوں میں جلن ہونے لگی۔

"یہ کراچی کے پیاز بھی واہیات ہیں" وہ بولا۔

"لاؤ۔ میں کاٹ دوں۔" صوفیہ نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔

"میری پیاری کزن تمہارے دیس میں مچھلی بکتی ہے مچھلی! تم کیا جانو کباب کا پیاز کیونکر کٹتا ہے۔"

میز پر کاغذ بچھا کر جب اس نے پیاز اس پر دھرا تو اس کی آنکھیں دھندلا چکی تھیں اور آنکھوں کے پیچھے سے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اختر نے اپنا ریشمی رومال نکالا



اور چہرہ دوسری طرف کر کے آنسو پونچھ لئے۔ صوفیہ مسکرا کر آگے بڑھی اور اس کے ہاتھ سے چھری لے کر بولی: "پیاز میں کاٹ دیتی ہوں۔ باقی مصالحہ تم بنا لو مجھے بڑی بھوک لگی ہے۔"

قیمے میں پیاز اور مصالحہ ملا کر ہیٹر پر اختر نے نیا فرائنگ پین چڑھا دیا تھوڑی دیر بعد اس نے بغیر رومال کے اسے اٹھایا تو یکبارگی منہ سے چیخ نکل گئی۔ صوفیہ نئی خریدی ہوئی چیزیں الماری میں رکھ رہی تھی۔ وہ گھبرا کر ہٹی اور پوچھنے لگی۔

"کیا ہوا اختر۔ کیا ہوا؟"

"بس ہوا تو کچھ نہیں، صرف تمہیں ڈرا رہا تھا۔"

ہنس کر اس نے کہا: "اب دیکھنا ڈرانے میں کوئی حادثہ نہ کر بیٹھنا۔"

ایک ہی بار فرائنگ پین میں پونڈ بھر گھی ڈال کر جب اختر نے کباب چھوڑے تو سارا کمرہ قیمے کے چٹخنے کے شور سے بھر گیا۔ اختر بہتیرا چھری اور چمچ سے قیمہ جوڑتا تھا لیکن قیمہ تو گھی پا کر جڑنے سے بالکل انکار کر بیٹھا۔ صوفیہ الماری کے پاس کھڑی ہنسنے لگی۔

"اختر کباب بن گئے؟" اس نے پوچھا۔

"بس یہ تجربہ ذرا فیل ہو گیا ہے۔"

اختر نے فرائنگ پین کا قیمہ پلیٹ میں اُتار لیا۔ اور نئے سرے سے چند کباب ڈالے۔

اُدھر قیمہ کھلا اُدھر صوفیہ ہنسنے لگی۔

صوفیہ ہنسے جا رہی تھی۔ ہنسے جا رہی تھی۔ اور اختر قیمہ اور ہیٹر چھوڑ کر اس کے قریب کھڑا تھا۔

"تم ہنس رہی ہو۔ اسی لئے کباب جڑ نہیں رہے۔"

ہنسی بڑھتی جا رہی تھی۔

"تم بہت بدتمیز ہو۔" اختر چلایا۔

"کباب چپلی ہوں گے کہ سیخ؟" ہنستے ہوئے صوفیہ نے پوچھا۔

"خدا کی قسم ہم پٹھانوں کا غصہ بڑا ہوتا ہے۔ بڑا۔ جان سے مار دیتے ہیں۔"

ہنسی کے مارے صوفیہ نے الماری کے ساتھ سر لگا لیا۔ اور سانس برابر کرتے ہوئے بولی۔ "ہائے اللہ مر گئی۔"

ہیٹر پر چڑھا ہوا فرائینگ پین تپ رہا تھا۔ اس میں پڑا ہوا قیمہ سیاہ ہو رہا تھا۔ اور اب جلنے کی بُو کمرے میں پھیلنے لگی تھی۔

اختر نے اسے دونوں بازوؤں سے جھنجھوڑا اور غصے میں چلایا۔ "چُپ کر جاؤ ورنہ بخدا میں تمہیں مار بیٹھوں گا۔"

صوفیہ خاموش ہو گئی بالکل خاموش۔ پھر اس نے آہستہ سے اختر کے ہاتھ اپنے بازوؤں سے الگ کئے۔ مضبوط ہاتھوں میں لمحہ بھر کو ننھے ننھے کنول کے پھول پڑے رہ گئے۔ پھر ان کنول کے پھولوں کو اپنی زرد ساڑھی کے ساتھ لپٹاتے ہوئے صوفیہ بولی۔

"میرا خیال ہے۔ قیمہ جل گیا ہے۔"

فرائینگ پین ہیٹر سے اتار کر وہ دونوں ڈائننگ روم کی طرف چل دیئے۔ لوگ کھانا کھا کر پلٹ رہے تھے۔ مہکتے ہوئے جسموں میں سے خوراک کی عطا کردہ تازگی پھوٹ رہی تھی۔ وہ دونوں خاموشی سے ایک میز پر جا بیٹھے۔

وہ تینوں ٹیکسی کی پچھلی طرف بیٹھے تھے۔ ٹیکسی بندر روڈ پر رواں تھی۔ دائیں بائیں اونچی اونچی عمارتیں، چمک دار دکانیں۔ اور لمبی لمبی بہتی کاریں رواں تھیں۔

آنا نے دائیں بائیں سر ہلایا اور بھڑک کر بولی۔ "پہلے ہاؤسنگ سوسائٹی۔"

"پہلے ایمبیسی پھر کہیں اور۔ ہاں۔" صوفیہ نے کہا۔



"پہلے ہاؤسنگ سوسائٹی۔"

"پہلے ایمبیسی۔"

آنا کا چہرہ تمتمانے لگا تھا۔ اور اس کی کرنجی آنکھیں بہت پھیل گئی تھیں۔ اس نے چڑ کر کہا۔ "قسم خدا کی یہ لڑکی تو نن ہے نن۔ اس کے جسم میں تو لہو ہی نہیں چلتا پھرتا۔ ورنہ یہ ایمبیسی کیوں جانا چاہتی ہے۔"

"کہہ تو چکی ہوں کہ مجھے وہاں کام ہے ابھی تک میری ہوسٹل کی سیٹ کا تعین نہیں ہوا۔ خدا جانے کہاں جا کر ٹھہروں گی۔"

کار بندر روڈ پر چلی جا رہی تھی اور اختر کنکھیوں سے ان دونوں کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"دیکھو اختر۔ تم فیصلہ کرو۔" آنا نے اختر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے ابھی پیکنگ کرنا ہے۔"

"تم تو کہتی تھیں کہ تمہارا سامان اب تک بند ہو چکا ہو گا۔ کار ٹنک جا چکی ہو گی۔" اختر نے پوچھا۔

آنا نے سرخ لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ "یہی تو کہہ رہی ہوں کہ میں نے ابھی تک سامان اس لئے پیک نہیں کیا ..... کہ مل کر آج کا دن ENEOY کریں گے۔ اختر اور میں ناچیں گے اور صوفیہ گانے گائے گی۔ اور پھر ہم تینوں بڑی ہلکی پھلکی قسم کی اداسی میں ڈوب جائیں گے۔ یہ جہاز میں چڑھ کر لندن روانہ ہو جائے گی۔ تم لاہور پہنچ جاؤ گے۔ اور میں سینٹ پیٹر کے آگے کبوتروں کے درمیان گھری ہوئی اس دن کو یاد کروں گی۔"

"تمہاری بات مجھے تو بہت زیادہ قابلِ قبول لگتی ہے۔" اختر بولا۔

صوفیہ آخری کونے میں بیٹھی تھی۔ اس نے اختر کی طرف منہ کر کے کہا۔ "جی ہاں۔

ہیں تو بقول اس کے نن ہوں۔ لیکن جناب ذرا سوچئے تو سہی بھلا دن کتنے رہ گئے ہیں۔ اگر میری بیٹ کا فیصلہ ہی نہ ہوا۔ تو میں اجنبی ملک میں جاکر کہاں دھکے کھاؤں گی؟"

آنا جھٹ بولی: "تم روم چلی آنا، میرے پاس۔"

اختر نے کندھے جھٹک کر کہا: "دیکھو تم دونوں بعد میں فیصلہ کرنا۔ فی الحال تم دونوں کی بات صرف ایک طرح سے طے ہو سکتی ہے۔"

"کیسے کیسے؟" آنا چلائی۔

کار بندر روڈ پر بہت دور نکل آئی تھی۔

"دیکھو مجھے آغا زمان علی کے ہاں کچھ کام ہے تم تھوڑی دیر وہاں چلی چلو پھر وہاں جو پروگرام بنے گا دیکھا جائے گا۔"

"اور ان کا گھر کہاں ہے؟" آنا نے پوچھا۔

"ہاؤسنگ سوسائٹی میں۔"

"منظور، منظور، منظور..." آنا چلائی۔

"تم مجھے ایسی چھوڑ جاؤ پیچ" صوفیہ نے التجا کی۔

"اس لڑکی میں SPORTSMAN SHIP بھی نہیں ہے۔ چلو اختر یہ ٹ باکس ہے۔ وہاں سے اسے سمندر میں پھینک آئیں، چلو؟"

"چاہے دو گھنٹے لگیں۔ لیکن ہوں گے تو ہم ہاؤسنگ سوسائٹی میں، نا، پاک ماریا یہ لڑکی کہاں سے میرے پلے پڑ گئی؟"

"اچھا بابا چلو" صوفیہ نے روہانسی ہو کر کہا۔

"ہاؤسنگ سوسائٹی ڈرائیور ہاؤسنگ سوسائٹی" کھلنڈری آنا بولی۔ اور پھر سینے پر صلیب کا نشان بنا کر بولی: "میرا تو جہاز میں پاک ماریا ہی ساتھ دے گی۔ ورنہ اس نن کے ساتھ تو بربادی ہی بربادی ہے۔"



ٹیکسی ہاؤسنگ سوسائٹی کی طرف روانہ ہو گئی۔ آنا پیروں سے تال دیتی، ہاتھوں کی چٹکیاں بجاتی ایک ہسپانوی گیت گانے لگی۔

زمان علی کراچی کے بہت مشہور کلیرنگ ایجنٹ تھے۔ ان کا لاکھوں کا بزنس تھا۔ کروڑوں کی ساکھ تھی۔ ہاؤسنگ سوسائٹی میں ان کا بنگلہ اگر کرائے پر ہوتا تو دو ہزار سے کم ماہوار نہ ملتے۔ لیکن فی الحال وہ اپنی چار لڑکیوں سمیت اس میں رہتے تھے۔ بیوی کا انتقال کئی برس ادھر ہو چکا تھا۔ اور اب ان کی بڑی لڑکی زرینہ سارے گھر کا کاروبار چلاتی تھی بٹوارے سے پہلے یہ لوگ دلّی میں رہتے تھے، اور وہاں بڑے وسیع پیمانے پر ان کے تین ہوٹل چلتے تھے۔

ہاؤسنگ سوسائٹی کی کوٹھی پر سرخ ٹائلز اور گرے بجری کا لیپ کچھ ایسے خوشنما ڈھب سے کیا گیا تھا کہ دور سے دیکھ کر کسی خوبصورت آرٹسٹ کی تصویر نظر آتی تھی۔ اوپر والی منزل سینما سکرین کی مانند چوڑی اور بغیر کھڑکیوں کے تھی۔ اس سکرین کی دیوار تمام کی تمام ٹائلوں سے آراستہ تھی۔ اوپر والی منزل کی کھڑکیاں گھر کے لان کی جانب کھلتی تھیں۔ بلکہ اوپر کوٹھے پر آغا زمان علی نے ایک باغیچہ اور فوارہ بنا رکھا تھا۔

جب یہ تینوں نشاط کا لج پہنچے۔ نور وبی نے انہیں اوپر والی منزل پر ہی بلوا لیا۔

کراچی جیسی جگہ میں جہاں پینے کا پانی کوسوں میل دور سے آتا ہے۔ ان کی دوسری منزل کے آدھے کوٹھے پر ہری بھری دوب قالین کی طرح بچھی تھی۔ وسط میں سنگ مرمر کا فوارہ چھینٹے اڑا رہا تھا اور اس کے گرد گملوں میں کئی قسم کے پھول کھلے تھے۔ روفی رنگ برنگی بید کی کرسیاں بچھائے بیٹھی تھی۔ اس نے بھڑکیلے رنگ کی نارنجی ساڑھی اور سیاہ بلاؤز پہن رکھا تھا۔ کانوں میں خانہ بدوشوں کی سی کھلی کھلی

بالیاں تھیں اور بال اختر کی طرح کٹے ہوئے تھے۔ آغا زمان علی کے گھر میں گھس کر تو اختر بھی اپنے آپ کو حقیر محسوس کرتا تھا۔ ایک زمانے میں اختر نے کچھ تھوڑی سی بہت روبی کے لئے کوشش کی تھی لیکن پھر یہ سوچ کر کہ جب چچا کی طرف سے ایک کوڑی بھی نہ ملی اور خالی خولی اختر علی خاں بی اے رہ گیا۔ تو آغا زمان علی اپنا ڈرائیور بھی نہ رکھیں گے۔ گھر سے بھی جائیں گے اور نشاط کاٹیج سے بھی۔

روبی اپنی جگہ سمجھتی تھی کہ اختر نے اسے PROPOSE نہ کرکے اس کی توہین کی ہے اس لئے جب کبھی بھی ان کی ملاقات ہوتی تو وہ اپنے تمام CHARMS داؤ پر لگا کر اسے مسخر کرنے کی کوشش کرتی۔

اختر کو دیکھتے ہی وہ چلائی: "اللہ جی! اب کھڑے کھڑے واپس چلے جاؤ، ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

"اختر بڑی سی سرخ کرسی پر دھنستے ہوئے بولا: "اچھا میں چلا جاتا ہوں۔ لیکن میری دوستوں کو تو بیٹھنے دو۔"

روبی کی آواز بہت پتلی اور TONE بہت اونچی تھی۔ اس پر کانونٹ کی پڑھی ہوئی انگریزی اور بولتی تو یوں لگتا جیسے مسلسل کانچ ٹوٹ رہا ہے۔

"تعارف تو کرا دو اپنی NEW FANS کا" اس نے شوخی سے کہا۔

"ان دونوں کا تو میں خود فین ہوں۔ یہ ہیں آنا۔ اطالیہ کی ایمبیسی میں کام کرتی ہیں اور آج کل میں واپس جا رہی ہوں وطن۔"

"یعنی کون سے وطن؟"

"ظاہر ہے اطالیہ، روم۔"

"اور یہ ہیں محترمہ صوفیہ ربیع الدین۔ انگلستان ایم ای ڈی کرنے جا رہی ہیں۔ بس چند دنوں میں کراچی پہنچنے سے پہلے ڈھاکہ میں پروفیسر تھیں۔"



"لیکچرار ــــ" روبی نے کرسی میں بیٹھی ہوئی چھوٹی سی صوفیہ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"جی ہاں۔ میں لیکچرار تھی۔ اکنومکس کی۔" صوفیہ نے جواب دیا۔

بات بہ بات گڑبڑ پیدا کرنے والی آنا خاموش تھی۔ کبھی اختر کی طرف دیکھتی تھی کبھی صوفیہ کی طرف۔

"کافی پلاؤ گی کہ چائے۔"

"تمہیں تو جوتے کھلاؤں گی بے مروت۔" روبی چہک کر چیخی۔ پھر اس نے زرد رنگ کی کرسی سے لگی ہوئی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ نیچے کہیں اس کی آواز اٹھی ہوگی۔ بظاہر تو گھنٹی بھی نظر نہ آتی تھی۔

"آغا صاحب کہاں ہیں؟" اختر نے سوال کیا۔

"وہیں اور کہاں۔" روبی نے جواب دیا۔

اختر خوب جانتا تھا کہ اس وہیں کا مطلب زمان علی کی لائبریری تھی۔ اس نے اٹھتے ہوئے کہا: "اچھا روبی تم ذرا ان لڑکیوں کا دھیان رکھنا میں ابھی آتا ہوں۔"

"ہائے اللہ چلے۔ کافی تو پیتے جاؤ۔" گول گول بالے جھلکاتی ہوئی روبی بولی۔

"تم لوگ شروع کرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

"دیکھو اختر۔ خدا کے لئے مردوں والی گوسپ میں نہ پڑ جانا۔ اگر دیر کی تو خدا قسم جوتے مار کر نکلوا دوں گی یہاں سے ہاں۔"

"دیکھنا جوتے ہائی ہیل والے نہ ہوں۔ مجھے سلیپروں کی عادت ہے۔" اختر سیڑھیاں اترتا ہوا بولا۔

"خدا قسم۔ خدا قسم بے حیا ہو تم اول درجے کے۔ مجھے تو خالدہ پر ترس آتا ہے۔ بدبخت ماری گئی۔ ماری گئی۔"

آغا زمان علی کی لائبریری کئی ہزار کتابوں پر مشتمل تھی۔ دیواروں کے ساتھ قطار در قطار شیشوں والی الماریاں لگی تھیں۔ ان میں چمڑے کی جلدوں والی مرصع قیمتی کتابیں نہایت نفاست سے رکھی تھیں۔ زمان علی کو کتابوں کا جنون تھا اور ان ہی کتابوں کے جنون میں ان کی ملاقات اختر کے چچا کے ساتھ ہوئی تھی۔ پرانے مسودے وہ کسی بھی قیمت پر خریدنے کو تیار ہو جاتا تھا۔ پھر ایسے نایاب مسودے اختر کے چچا بہم پہنچاتے تو ان کی قیمت کئی بار ہزاروں میں پہنچ جاتی۔

جب اختر نے لائبریری کا دروازہ کھٹکھٹایا تو انہوں نے کالی آبنوسی میز پر اپنی عینک رکھ کر بڑی مدھم آواز میں پوچھا: "کون ہے؟"

"میں ہوں جی اختر۔ اختر علی خان۔"

"کون اختر؟" کھچڑی پکی داڑھی والے نے پوچھا۔

"جی احمد خان کا بھتیجا۔ اختر۔"

"آؤ آؤ اختر بھئی آ جاؤ۔" انہوں نے کتاب میں بک مارک پھنسا کر کہا۔

اختر ان کے پاس جا کر ایک نیچی تپائی پر بیٹھ گیا۔ سارے کمرے میں آبنوسی لکڑی کا فرش تھا۔ اور کتابوں کی باس پھیلی تھی۔

"کیسے آنا ہوا اختر؟" زمان علی نے پوچھا۔

"بس جی کراچی آیا تھا۔ سوچا آپ کو سلام کر چلوں۔"

زمان علی نے مسکرا کر کہا: "بہت اچھا کیا۔ آج کل تو نئے دوستوں کا زمانہ ہے بھئی۔ کوئی بزرگوں کو نہیں پوچھتا۔ بس روپے سے مطلب ہے روپے سے۔"

"جی بالکل۔ جی۔"

زمان علی نے پاؤں ہلاتے ہوئے کہا: "دور کیوں جاؤ۔ وہ اپنا امیر الدین ہے نا۔ میرے سامنے ایبنڈرسن کمپنی میں خود میری سفارش سے لگا تھا۔ کہ میں کر میں نے اُسے



دو سو دس کا سٹارٹ دلوایا تھا۔"

"کون جی۔ امیر الدین مینیجنگ ڈائریکٹر؟"

"جی ہاں وہی سوّر۔ دو سو دس کا سٹارٹ دلوایا تھا۔ تب تو سو سو پھیرے ڈالتا تھا۔ ایک بیوی خوش قسمتی سے قبول صورت مل گئی۔ بس اُسے زینہ بنا کر چڑھتا چلا گیا۔ چڑھتا چلا گیا۔"

اختر کی نظروں میں اپنی اور خالدہ کی شبیہ ابھری۔ خالدہ جیسی بیوی کے ساتھ واقعی انسان کا مستقبل کتنا روشن ہو سکتا تھا۔

زمان علی کہنے لگے: "اس کراچی میں کس کس کی ہسٹری مجھ سے چھپی ہے۔ تمام افسروں کو جانتا ہوں سارے بزنس مین میرے ہاتھوں میں بنے ہیں۔ ارے کس کس امیر الدین کو گنواؤں زمانہ بھر گیا ہے ایسے لوگوں سے اب کس کس کا رونا روئیں۔"

"بالکل...... بالکل......" اختر نے اتفاق رائے کرتے ہوئے کہا۔ واقعی وہ بھی یہی سمجھتا تھا۔

"چچا جان، وہ کاروں کا بزنس کیسا جا رہا ہے آپ کا؟"

"کچھ اب کام مشکل ہو چلا ہے۔ لیکن خیر صاحب چلتا ہے۔"

اختر جب سے کراچی پہنچا تھا۔ زمان علی سے ملنے کی اسے بڑی تمنا تھی۔ ان کی بل ایئر اب TIME BAR ہو چکی تھی اور اختر اسے بیچنا چاہتا تھا۔

"چچا جان۔ وہ ہماری بل ایئر کے لئے گاہک ڈھونڈ دیجئے۔"

زمان علی نے میز پر KNUCKLES بجاتے ہوئے کہا: "ہاں بل جائے گا۔ گاہک تو بیسیوں پھرتے ہیں۔"

"کچھ لوگ تو لاہور میں بھی گاڑی خریدتے ہیں لیکن وہاں قیمت کم ملتی ہے۔"

زمان علی نے کرسی کے ساتھ پشت لگا لی اور سر ہلا کر بولا: "ٹھیک ہے سارا

بزنس مین تو کراچی میں ہے سارے پیسے کی کھپت تو یہاں ہے۔"

"چچا تو شاید رضامند نہ ہوں وہ کہہ رہے تھے مشکل سے پرمٹ ملا ہے۔"

"تو نئے پرمٹ کے لئے درخواست دے دیں۔ اس اثنا میں کوئی چھوٹی گاڑی کام دے سکتی ہے۔"

اختر نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ "یہی میری سکیم ہے۔"

"تو برخوردار یہ کونسا مشکل کام ہے۔ مل جائے گا گاہک تم گاڑی بھجوا دو جاکر۔"

اختر نے اٹھتے ہوئے معذرت بھرے لہجے میں بات کی۔ "خوامخواہ آپ کی سنڈی میں مخل ہوا۔ اچھا تو اجازت دیجئے۔"

"میاں لونڈے کیوں لاہور میں رہ کر اپنی عاقبت تباہ کر رہے ہو۔ کراچی نوجوانوں کا شہر ہے پیسہ کمانے والوں کا شہر ہے۔ شادی ہو جائے تو یہاں آکر بس جانا۔"

"جی کچھ سوچ رہا ہوں۔"

زمان علی نے دوبارہ کتاب کھول لی۔ اور بک مارک صفحے سے نکال کر بولے

"سوچنا وچنا کیسا ارے جب کس بل نہ رہے گا۔ تو پھر دولت کمانے کا سوچو گے۔ ہمارے جیسے لوگ نہیں ملا کرتے۔ ایک بزنس دیں تو لاکھوں میں کھیلنے لگو۔"

اختر دروازے تک پہنچ گیا۔ اور سلام کرنے کے انداز میں ہاتھ ہلا کر بولا۔

"میں جی خود آپ سے فیض حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ دیکھئے کیا بنتا ہے۔"

زمان علی نے مسکرا کر سر کو جھکایا اور کہنے لگا: "شادی کی تاریخ کب مقرر ہوئی ہے۔"

"جی ابھی تو کچھ فیصلہ نہیں ہوا میری دادی کا انتقال ہو گیا تھا پچھلے دنوں۔"

"اوہو۔" سن کر بہت افسوس ہوا۔ زمان علی بولے۔

"جی برسوں سے روگی تھیں۔ WHEEL CHAIR پر ان کی زندگی



گزرتی تھی۔"

"اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ واقعی افسوس ہوا سن کر۔"

اختر نے ایک بار پھر سلام کے انداز میں ہاتھ کو ماتھے کے قریب لاتے ہوئے کہا۔ "اچھا جی۔ اب اجازت دیجئے۔ اگر کچھ دیر اور کراچی میں ٹھہرا تو پھر حاضر خدمت ہوں گا۔ آداب۔"

زمان علی اپنی کتاب پر جھک گئے۔ اور دبے پاؤں اختر پھر اوپر والی منزل کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

وہاں کہرام آیا ہوا تھا۔ رذبی کی تیکھی آواز فوارے کے شور پر غالب آ چکی تھی۔ اس کا رنگ اپنی تاریخی ساڑھی کی طرح تمتمایا ہوا تھا۔ صوفیہ بھی سفید کرسی پر آگے ہو کر بیٹھی تھی۔ اور اس کا دبلا پتلا چہرہ ناراض لگتا تھا۔ صرف آنا جا نگیں آگے کئے نہایت اطمینان سے پنیر کے ننھے ننھے ٹکڑے مسلسل کھائے جا رہی تھی اور کافی پی رہی تھی۔

"اب آپ سے تو بات کی جا سکتی ہے۔ آپ مشرقی پاکستان کی ہیں لیکن یہ پنجابی تو بہت OFFENCE لیتے ہیں۔ ایسی باتوں پر۔" رذبی نے SHRILL آواز میں کہا۔

صوفیہ خاموش رہی۔

"بھلا آپ ہی بتائیے کلچر ہمارا کیا ہے۔ بتائیے تو۔ نہ یہاں آرٹ ہے نہ میوزک ہے نہ سنگتراشی۔ بھلا ہم لوگ کس چیز پر کلچر کلچر پکارتے ہیں۔"

صوفیہ نے قدرے چڑ کر پوچھا۔ "وہ جو حبشی قومیں افریقہ میں آباد ہیں ان کے پاس تو آپ کی رو سے کوئی کلچر نہ ہوا۔"

آنا نے صوفیہ کو غور سے دیکھا۔ اور جب اس کی بات سمجھ گئی۔ تو منہ میں پنیر کا

ٹکڑا ڈال کر بولی: "بھائی اگر ان کے پاس سنگیت نہیں ہے تو پھر دُنیا آواز کی دلکشی کا معیار تو سمجھ ہی نہیں سکتی۔"

رقیبی بولی: "دراصل صوفیہ بہن میں ان کے کلچر کی قائل نہیں ہوں۔ اگر ان کے پاس کلچر ہوتا۔ تو۔۔۔ ۔۔ ارے تم آ گئے منحوس۔"

"یہ کیا بک بک جھک جھک ہے۔"

"بھائی تم اس بحث میں شریک نہیں ہو سکتے۔ پنجابی انتہا کے متعصبی ہیں غضب کے۔"

"متعصب دراصل اپنی برتری کے احساس سے پیدا ہوتا ہے۔" اختر نے سفید کرسی کے پاس کھڑے ہو کر کہا: "اب اس آنا سے پوچھ لو۔"

"میرا نام کیوں لیا تم نے؟" آنا نے جھٹ انگریزی میں پوچھا۔

"میں رقیبی سے کہہ رہا تھا کہ روم کی ہر ترقی کی بدصورت ہوتی ہے اب آنا ہی کو دیکھو۔"

آنا نے جھٹکے کے ساتھ اپنے سنہری بالوں کو کندھے تک لا کر کہا: "ہاں اگر صوفیہ یہ بات کہتی تو ٹھیک بھی تھی تمہارے منہ سے تو یہ بات ذرا نہیں جچتی۔"

رقیبی نے چڑ کر کہا: "بھئی تم اتنی جلدی کیوں آ گئے۔ یہاں ایسے مزے کی HIGH LEVEL کی باتیں ہو رہی تھیں۔"

اختر نے اپنے سنے پیالی میں کافی ڈالی اور گھاس پر بیٹھ گیا۔ سفید کرسی اس سے صرف ہاتھ بھر دور تھی۔

"خود ہی تو کہا تھا کہ مردوں والی گوسپ میں نہ پڑ جانا۔"

صوفیہ اب ڈھیلی ہو کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ رقیبی نہایت روانی کے ساتھ آنا سے روم کی باتیں کر رہی تھی۔ اسے دو تین بار یورپ جانے کا موقع ملا تھا اور وہ روم سے بخوبی واقف تھی۔ صوفیہ نے اختر کی طرف دیکھا اور



چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا

بولی: "ابھی جانا ہے مجھے۔"

اختر نے اپنی پیالی چاندی کے کافی سیٹ کے پاس رکھ دی اور آنا کو آنکھ مار کر چلنے کا اشارہ کیا۔

"یہ پنیر بہت مزے دار ہے۔" آنا نے ایک اور ٹکڑا اٹھاتے ہوئے کہا۔

"جس حساب سے تم پنیر کے پیچھے پڑی ہو۔ اس حساب سے کمر کے گرد ایک ٹائر بندھ جائے گا شام تک۔" اختر اٹھتے ہوئے بولا۔

آنا نے ٹکڑا منہ میں ڈالا اور بولی: "ہمارے دیس کا رواج ہے کہ لڑکیاں ڈبلی ہوتی ہیں اور عورتیں فربہ ہوتی ہیں فربہ۔ اگر میں ڈبلی رہ گئی تو میرا فدن ساتو غم سے دیوانہ ہو جائے گا۔"

"فدن ساتو کون؟" صوفیہ نے پوچھا۔

"میرا منگیتر۔"

"چل بڑی آئی فدن ساتو والی۔" اختر نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔ "تجھے نہیں مل سکتا فدن ساتو۔ چل ٹیکسی کھڑی ہے۔"

"ابھی ملا نہیں لیکن مجھے واپس پہنچ لینے دو۔ پھر تمہیں لکھوں گی۔ آدھے روم کو آگ لگ جائے گی۔ آدھے روم کو۔"

ٹیکسی میں آنا ان دونوں کے درمیان بیٹھی تھی اور وہ آپس میں بچوں کی طرح جھگڑ رہے تھے۔

"تم آنا میرے پاس سیدھی ڈھاکہ آنا۔ ایڈن کالج۔"

اختر زور سے چلایا۔ "ڈھاکہ میں کیا دھرا ہے جب آؤ گی تو لاہور آنا۔ لاہور لاہور پاکستان کا دل ہے دل۔"

"دل نہیں چھیڑا ہے چھیڑا...... میں اور تم راج گھاٹ جائیں گے۔ آنا وہاں ماں چائے کے باغ میں کام کرتی ہے میں تمہیں میلوں لمبے چائے کے باغات دکھاؤں گی۔ ہمارا دیس شونار بنگلہ ہے۔ شونار بنگلہ۔"

"شونار بنگلہ وہ کیا چیز ہوتی ہے؟" آنا نے پوچھا۔

"سنہری بنگال ۔۔۔ ۔۔ سُن آنا میں تجھے بلدہ گارڈن دکھاؤں گی" صوفیہ بولی۔

"ارے جناح باغ کے سامنے بلدہ گارڈن کی کیا حیثیت ہے۔ جانِ من لاہور آنا۔ شالیمار میں تجھے گیارہ ڈیزی گن کی سلامی ملے گی۔"

"کرنا فلی ڈیم پر لے چلوں گی آنا۔ جنگل میں منگل دیکھنا ہو تو بنگال آنا بنگال۔"

اختر چلایا: "بنگال ونگال کا جادو اب ختم ہو چکا ہے جس نے جہانگیر کا مقبرہ نہیں دیکھا۔ اس نے کچھ نہیں دیکھا بس۔"

"آنا لاہور میں نہ سنگیت ہے نہ آرٹ نہ سنگتراشی وہاں کیا دیکھے گی بھلا" صوفیہ بولی۔

اس پر تینوں کو ہنسی آ گئی۔

لیکن جلدی سے اختر نے محاذ قائم کر لیا: "لاہور زندہ باد۔ جو لاہور نہ آئے وہ کافر۔"

"جو ڈھاکہ نہ آئے وہ کافر بھی۔ مرتد بھی۔ ہاں۔"

آنا نے اپنے بازو پھیلائے اور ان کے سر پکڑ کر ٹکرا دیئے: "ایک بار ہی ٹکر مار کر کیوں نہیں مر جاتے۔ پہاڑی بکرو۔"

صوفیہ ماتھا ملتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی اور اختر نے کہا: "قسم آنا ہمارے ہاں ایک محاورہ ہے کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔"

آنا چمک کر بولی: "اور تم نہیں جانتے کہ دنیا کی تمام سڑکیں روم جاتی ہیں اب دیکھو نہ تو میں لاہور آؤں گی اور نہ ہی ڈھاکہ۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ



اس بار میں روم میں بس جاؤں گی۔ پھر تم دونوں میرے پاس آنا اکٹھے۔ میں تمہیں اپنے گاؤں لے جاؤں گی ہمارے گھر کے ساتھ انگوروں کا باغ ہے ہم تینوں وہاں گھومیں گے اور پھر ہم اپنے فلیٹ روم جائیں گے۔ میں تمہیں سینٹ پیٹر دکھاؤں گی۔ اور وہاں کی سڑکوں پر باغوں میں بانہیں ڈالے پھریں گے۔ یعنی ہم چار تب تک میرا فدن ساتو ساتھ ہو گا۔"

لمحہ بھر کو اختر کی نگاہوں نے صوفیہ کی نظروں کو اپنی گرفت میں لے لیا اور پھر جیسے خود ہی شرمندہ ہو کر یہ گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اور وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

ابھی مہینہ بھر ادھر کی بات ہے کہ اس نے خالدہ کے ساتھ روم میں ہی اپنا ماہِ عسل منانے کا پروگرام بنایا تھا۔ خالدہ تو پیرس جانے پر بضد تھی۔ لیکن وہ ہر بار روم ہی پر زور دیتا۔

خالدہ کہتی: "قسم اختر وہاں گٹار بجانے والے ہیں۔ وہاں خانہ بدوش لوگ ہیں جو نہایت رومانوی فضا مہیا کرتے ہیں ہم کسی PATIO میں رہیں گے۔ اور رات رات گئے تک باتیں کیا کریں گے۔"

"نال بھئی سپین سے بہتر تو کاہنا کاچھا ہے۔ اگر تمہاری وجہ سے وہاں کسی آدمی سے میرا جھگڑا ہو گیا۔ تو میں کہاں ڈوئیل لڑتا پھروں گا۔"

اسی بات پر خالدہ نے ہنس کر بات مان لی اور وہ پروگرام بنانے لگے پہلے کہاں جانا ہے؟ خالدہ کہتی پہلے دن کلوسیم دیکھیں گے۔ اور اختر کہتا نہیں بھئی ایمفی تھیٹر اور جب بحث بہت چل نکلی تھی تو اختر نے خالدہ کے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر کہا تھا۔ "جانِ من نہ کلوسیم پہلے دن دیکھا جائے گا نہ ایمفی تھیٹر۔ پہلا دن تو بستر میں ہی کٹے گا۔"

اور جب خالدہ نے اس کے سینے پر گھونسہ مار کر کہا تھا: "تو بے شرم کہیں کے۔"

تو وہ جلد معصوم بن کر بولا: "ہیں بے شرمی کا ہے کی، کیوں سفر کی تھکان نہ ہو جائے گی بھلا؟"

اختر نے نگاہیں باہر کے چلتے مناظر پر جما دیں اور سوچا بہر کیف خالدہ کی تجویز بہتر ہے ماہ عسل ہم سپین میں ہی منائیں گے اسے علم ہی نہ ہوا کہ کب ٹیکسی آنا کی کوٹھی کے سامنے رکی اور کب دونوں لڑکیاں ٹیکسی سے اتر کر برآمدے میں پہنچ گئیں۔

رات کی خاموشی سارے آسمان پر پھیلی ہوئی تھی۔ سمندر کنارے چڑھنے والا چاند آدھے آسمان تک پہنچ گیا تھا۔ اور اب اس کا زرد پیالہ سنہری نظر آتا تھا۔ وہ تینوں سیڑھیوں پر بیٹھے تھے۔ اندر کمرے میں پیاز والی دیوار پر کم روشنی کا بلب جل رہا تھا اور اس کی روشنی میں آدھ کھلے دروازے سے گہرے قالین اور سرخ صوفے کا کچھ حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ خلافِ معمول آج آنا سب سے زیادہ خاموش تھی ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے اس کے ہلکے پھلکے ریشمی بالوں کو ماتھے سے ہٹا ہٹا کر اڑا رہے تھے۔

یہاں گھر پہنچنے پر نہ تو وہ اور اختر ناچے، نہ ہی انہوں نے صوفیہ سے گانے کی فرمائش کی۔ کوچ کا نقارہ ابھی سے ان کے کانوں میں گونجنے لگا تھا۔ راستے میں ایک بار جب صوفیہ نے کہا تھا۔ ذرا ایبسی چلی چلو نا۔ قسم تمہیں پاک ماریہ کی۔"

تو آنا نے سینے پر صلیب کا نشان بنا کر جواب دیا تھا: پاک ماریا میرے گناہ بخشے لیکن آج کی رات آج کی چاندنی ایسے جرم کے قابل نہیں آج تو ناچیں گے گائیں گے اور خوب ہڑ مچائیں گے۔ اور پھر کل میں سنجیدگی سے بیٹھ کر اپنا سامان بند کروں گی۔"

اختر نے کہا "اور وہ کار کیوں بیچ دی آپ نے کم از کم تین چار دن اور اس کی سیر کر لیتے۔"

آنا نے گھبرا کر جواب دیا: "میں کہتی ہوں اگر تین دن بعد کار بیچتی تو وہ رقم بھی



نہ ملتی جو ادا کر کے میں نے اسے خریدا تھا۔"

"تم نے مجھ سے کہا ہوتا۔ تو میں زمان علی کی معرفت تمہیں خوب دام دلوا دیتا۔"

"واقعی۔ واقعی۔"

اور جب اختر نے اُسے زمان علی کا اپنے ساتھ کیا ہوا وعدہ بتایا تو آنا کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اور وہ کتنی ہی دیر بیٹھی افسوس کرتی رہی کہ اس نے اپنی جیلی کار کیوں سستے داموں بیچ دی۔

چاند کی روشنی بہت تیکھی ہو گئی۔ سمندری ہوائیں بہت تیزی سے چلنے لگیں۔

اختر نے بالآخر آنا سے کہا: "مجھے علم نہیں تھا کہ تم ایسی بیہودی جو ابھی تک اس کا افسوس نہیں گیا۔"

آنا نے اپنے گھٹنوں کے گرد بازو حمائل کر لئے اور پھر سر اوپر لٹکا کر بولی: "اس وقت غیر سنجیدہ باتیں نہ کرو اختر۔ مادر فطرت خفا ہو جائے گی۔"

پھر اس نے صوفیہ کی طرف رُخ کیا اور اس کے بالوں کو چھو کر کہنے لگی۔

"میں بھی صوفیہ اپنے ملک جا کر لمبے بال رکھوں گی۔"

"مجھے تو لمبے بال بڑے واہیات لگتے ہیں۔" اختر بولا۔

صوفیہ نے ترچھی سی نگاہ اس پر ڈالی اور خاموش رہی۔

"تمہیں لگتے ہیں۔ ہاں اور بھی کسی کو نہیں۔ لیکن مجھے ڈر ہے صوفیہ کہیں تم انگلستان جا کر انہیں کٹوا نہ بیٹھو۔ اگر تم نے انہیں کٹوا دیا اور مجھے علم ہو گیا تو مجھے بڑا رنج ہوگا۔"

"اگر صوفیہ بال کٹوا ڈالے اور مجھے علم ہو جائے کہ یہ کٹ چکے ہیں تو میں اس کی زیارت کرنے ڈھاکہ جاؤں گا۔ قسم سے۔"

"کہہ تو رہی ہوں غیر سنجیدہ باتیں نہ کرو، دیکھو نہیں رہے چاند کہاں جا پہنچا ہے۔"

وہ تینوں کتنی ہی دیر خاموشی سے چاند کو تکتے رہے۔

پھر آنا نے پچھلی سیڑھی پر بیٹھی صوفیہ کے گھٹنوں پر سر رکھ دیا اور کہنے لگی "صوفیہ پردیس میں تم پر بھی کبھی ایسی راتیں آئیں گی جب اک نہ معلوم غم تمہاری ساری شخصیت پر چھا جائے گا۔ نہ اس میں اپنوں سے بچھڑنے کا غم ہو گا اور نہ ہی تنی محبتوں کی کسک ہوگی۔ یہ غم تمہاری شخصیت کا پردہ کھول کر کے گا۔ انسان ہر جگہ انسان ہے اس پر نہ قوم نہ وطن نہ ملت نہ نسل غالب آسکتی ہے اور تمہارے اردگرد اس وقت خدا جانے کون سی قوموں کے لوگ بیٹھے ہوں گے لیکن تم ان کی محبت میں اس طرح گرفتار ہو جاؤ گی جیسے وہ تمہارے ماں جائے ہوں جیسے انہوں نے تمہارے ہی ڈھاکہ میں جنم لیا تھا۔ اور تمہاری ماں کی ساڑھی پکڑ کر وہ بڑے ہوئے تھے۔"

اختر نے آنا کو کندھے سے جھنجھوڑ کر کہا: "آنا کسی فدن سا تو کی بات کرو۔ یہ کیا فضول بات ہے؟"

آنا نے کندھے کو اس کی گرفت سے چھڑایا اور کہنے لگی: "اختر غیر سنجیدہ باتیں نہ کرو۔ تم ایسے غم سے کبھی واقف نہیں ہو سکتے۔ یہ غم بڑا ہی لطیف ہوتا ہے جیسے عورت پہلی محبت کرتی ہے۔ جب پہلی مرتبہ اسے احساس ہوتا ہے کہ اب چاند راتوں میں محض گڑیا کو سلاتے سلاتے نیند نہیں آئے گی پہلی محبت اور اس کا ان جانا مزہ۔ اس کا لطیف سا غم جیسے حلق میں شہد کی مٹھاس اور کونین کی کڑواہٹ اکٹھی گھل مل گئی ہوں؟"

پھر آنا نے صوفیہ کی طرف چہرہ اٹھا کر پوچھا: "تمہیں کبھی کسی سے محبت ہوئی ہے صوفیہ تم نے اس کیفیت کو کبھی محسوس کیا ہے؟"

صوفیہ نے منہ پرے پھیر لیا اور خاموش رہی۔

آنا نے ایک بار پھر صوفیہ کے گھٹنوں پر اپنا سر رکھ دیا اور بولی: "مجھے آج تک



اپنی پہلی محبت یاد ہے روم سے دس میل دور میں جس کونونٹ میں پڑھتی تھی وہاں برورانیتو نیو ہماری جماعت کو عبادت کرنا سکھایا کرتے تھے صوفیہ تم نے شاید ہم کیتھولک لوگوں کا عبادت گھر نہیں دیکھا وہاں رنگین شیشوں میں پاک ماریا کی تصویریں بنی ہوتی ہیں۔ محراب اور تمام چھت پر حضرت مسیح اور اس کے برگزیدہ بندوں کے بت گھڑے ہوتے ہیں ایسے ہی عبادت گھر میں برورانیتو جب بائبل کھول کر ہمیں پڑھاتے تو میری نظریں ان کے چہرے پر جم جاتیں۔ اور پھر اس وقت تک نہ جھکتیں جب تک وہ بائبل کو چوم کر حمد گانے میں مصروف نہ ہو جاتا۔ اس کی آواز بہت خوبصورت تھی اگر وہ برہم چاری نہ ہوتا تو کسی کانسرٹ میں نامی گرامی گلوکار ہوتا۔

میری سہیلی کہنی مارتی اور مجھے حمد کی طرف متوجہ کرتی۔ لیکن میرے لب نہ کھلتے میرے حلق سے آواز نہ نکلتی۔ اور جب برورانیتو مجھ تک مقدس شراب اور روٹی لے کر آتا تو میرے ہاتھ کانپنے لگتے۔ میری آنکھوں میں آنسو آجاتے اور میرا جی چاہتا کہ میں ہمیشہ کے لئے کسی بنچ کے نیچے چھپ جاؤں وہ تمام لڑکیوں کو باری باری آشیرباد دیتا اور جب وہ مجھ تک پہنچتا تو مجھے محسوس ہوتا کہ اس کے قدم ڈھیلے پڑ گئے ہیں اور وہ آگے جانا نہیں چاہتا اس کا ہاتھ تتلی کے سے لمس سے میرے بالوں کو چھوتا اور پھر وہ صلیب کا نشان اپنے سینے پر بنا کر آگے چلا جاتا۔ لیکن جہاں سے برورانیتو گزرتا پھر اس راہ سے میری نگاہیں نہ اٹھتیں۔ راتوں کو میری سسکیاں اس قدر بلند ہو جاتیں کہ قطار میں میری کی لڑکیاں اٹھ اٹھ کر مجھے گالیاں بکتیں اور پھر تھک کر خاموش ہو جاتیں۔ لیکن میرا غم میرا پیچھا نہ چھوڑتا۔ اونچی اونچی کھڑکیوں پر برف کے گالے ٹکراتے پھر سرد ہوائیں ان گالوں کو اڑانے لئے پھرتیں۔ سرد راتوں کی ہوائیں بہت ظالم ہوتی ہیں۔ ان میں انسان کا غم بہت جان لیوا ہوتا ہے میں بھی ساری رات

ان ہی ہواؤں میں ڈولتی ڈولتی خدا جانے کہاں کہاں پھرتی رہتی، اور جب صبح کی دھندلائی روشنی میری کھڑکی پر دستک دیتی تو میں اس تکیے پر سر رکھ کر سو جاتی جس پر برادر انیتو دو زانو رکھ کر دعا مانگا کرتے تھے۔ میں نے زندگی میں صرف ایک چیز چرائی ہے یہ وہ چھوٹا سا تکیہ تھا جسے برادر انیتو دعا کے وقت گھٹنوں کے نیچے رکھتے تھے۔"

صوفیہ کی آنکھوں میں چھوٹے چھوٹے آنسو جگمگانے لگے تھے اور وہ انھیں پینے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

آنا کہتی گئی۔ "پھر میں نے سنا کہ برادر انیتو نیو واشیکن جا رہے ہیں مجھ پر گویا بجلی گر گئی۔ میں نے سوچا تھا کہ وہ ساری عمر مجھ سے پاک ماریا کی عبادت کرواتا رہے گا۔ اور میں ساری عمر اس کی پرستش کرتی رہوں گی اور ایک دن کسی ایسی رات کو جب برف کھڑکی کے تمام شیشے بھر دے گی مجھے تکیے پر سر رکھے نیند آ جائے گی ابدی نیند اور پھر کوئی غم باقی نہ رہے گا۔ کوئی آنسو نہ رہیں گے۔ اور کھڑکیوں پر برف گرنا بند ہو جائے گی۔"

آنا کی آنکھیں خشک تھیں لیکن اس کی آواز اب بھی آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس نے گھٹنوں سے سر اٹھایا اور کہنے لگی: "اس رات بادل چھائے تھے لیکن بادلوں کو کاٹ کر کبھی کبھی اسی طرح پورا چاند دودھیا زمین پر پڑتا تھا۔ بہت سردی تھی بہت زیادہ۔ مجھے علم تھا کہ صبح برادر انیتو نیو ہماری کونونٹ چھوڑ کر چلا جائے گا۔ میں اس درخت تلے چھپ کر بیٹھ گئی جس کی سیاہ ڈالیوں پر تازہ برف چونے کی طرح چمک رہی تھی۔ پھر برادر انیتو ادھر سے گزرا۔ بڑی مشکل سے میں اس کی راہ میں کھڑی ہو گئی میرے قریب پہنچ کر اس نے پوچھا: "اتنی رات گئے تم یہاں کیا کر رہی ہو آنا؟"

اور میرے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔ بس میں اس کے قدموں میں جھک گئی اور جھکتی ہی چلی گئی۔ مجھے علم نہ ہوا کہ کب برادر نے مجھے اٹھایا اور میرے سینے پر صلیب



کا نشان بنا کر آہستہ سے آگے بڑھ گیا۔ اس روز پہلی بار میرے لئے دنیا ختم ہو گئی۔"

پھر آنا نے صوفیہ سے اصرار سے پوچھا: "صوفیہ کبھی تمہیں بھی کسی سے محبت ہوئی ہے؟"

صوفیہ خاموش رہی۔ لمحہ بھر کے لئے اختر نے اس کی نظروں کو ٹٹولنا چاہا لیکن وہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

ٹیکسی ہوٹل کی طرف جا رہی تھی۔ چاند اب ڈوبنے والا تھا، اور اس کی گردن میں وہ تیزی نہ رہی تھی۔ صوفیہ اور اختر الگ تھلگ بیٹھے تھے، اور خاموش تھے۔ جب ہوٹل کی بتیاں نظر آنے لگیں تو اختر نے پوچھا: "صوفیہ ایک بات پوچھوں؟"

"ہوں۔"

"کبھی تمہیں کسی سے محبت ہوئی ہے؟"

صوفیہ نے لمحہ بھر کے لئے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی: "وہ دیکھئے ہوٹل آ گیا۔" ٹیلی فون کی گھنٹی کتنی ہی دیر بجتی رہی۔

نوردین ڈریسنگ ٹیبل کی چیزیں جھاڑ جھاڑ کر لگا رہا تھا۔

اختر کی نیند ٹوٹ چکی تھی۔ لیکن ابھی کسلمندی باقی تھی، اور وہ کسی سے بات نہ کرنا چاہتا تھا۔

نوردین نے بالآخر فون کا چونگا اٹھایا: "جناب میں نوردین بول رہا ہوں جی ہوٹل سے۔ جی نو نمبر سے جی۔ جی وہ سو رہے ہیں؟"

پھر نوردین نے کنکھیوں سے اختر کی طرف دیکھا اور بولا "جی میں کیسے جگا سکتا ہوں۔ آپ کا حکم تو ہے جی لیکن ان کا بھی حکم ہے۔"

اختر اوندھا لیٹا تھا۔ اس نے ذرا سا سر اٹھایا اور آنکھوں کی جھری سے نوردین کی طرف دیکھ کر بولا: "کون ہے نیرا؟"

"حضور کوئی مس زمان علی ہیں۔"

زیرِ لب لاحول پڑھتے ہوئے اختر نے ہاتھ بڑھا کر چونگا اٹھایا۔

"ہیلو۔" وہ لمبی سی جمائی لے کر بولا۔

"ہیلو۔" روبی کی آواز آئی۔ "توبہ۔ LAZY BONES ابھی تک سو رہے ہو۔"

"رات دیر تک تمہاری یاد ستاتی رہی سو نہ سکا۔"

دوسری جانب ایک تیز قہقہہ اُبلا اور دیر تک اُبلتا رہا۔

"یقین نہ آئے تو میرے بیرے سے پوچھ لو۔" اس نے فلرٹ کیا۔

"ہائے توبہ...... توبہ اچھا سنو، وہ کل مشرقی بنگال والی تمہارے ساتھ کون تھی۔ مجھے تو بہت CURISITY ہو رہی ہے۔ اس کے متعلق؟"

"ناقابلِ ذکر۔ معمولی تم اپنی سناؤ۔" اختر بولا۔

"ہمارے ساتھ دوپہر کا کھانا کھاؤ۔ بغیر اپنی FANS کے۔"

"کیوں کوئی خاص بات ہے کیا؟" اختر نے پوچھا۔

"ہندوستان سے میری سہیلی مادھوی چیٹرجی آئی ہیں۔ غضب کا ناچتی ہے۔ بھارت ناٹیم، کتھا کلی وغیرہ۔"

اختر نے ہنس کر کہا۔ "میں تو تب آتا ہوں۔ اگر تم والز میرے ساتھ کرنے کو تیار رہو۔"

پھر قہقہہ اس کے کان سے ٹکرایا اور اس نے چونگا ذرا پرے کر دیا۔

"توبہ LAZYBONES اب اٹھو خدا قسم گیارہ بج گئے ہیں گیارہ۔"

"اچھا۔ لیکن تمہیں یہ صبح خیزی کی عادت کب سے پڑ گئی۔ جانِ من۔"

"جانِ من خوب خوب۔"

پھر چونگا ذرا پرے ہو گیا۔ اور قہقہے نوردین کو مسکرانے پر اکسانے لگے۔



"تو پھر لنچ ہمارے ساتھ ہو گا۔ خدا قسم اتنا اتراؤ نہیں۔ اگر تم پردیسی نہ ہوتے تو کون تمہیں پوچھتا۔"

"تم اور کون۔" ہنس کر اختر بولا۔

"ہائے اللہ کس قدر بے حیا اور ڈھیٹ ہو۔ قسم ہی کرتا ہے یہ فون ابھی تمہارے منہ پر دے ماروں۔"

"بسم اللہ کرو۔ بسم اللہ سر حاضر ہے۔"

پھر قہقہہ اٹھا تیکھا۔ تیز اور مسلسل۔

"ہائے بتاؤ مجھے دیر ہو رہی ہے کہیں اس بنگالن کے چکر میں نہ پڑ جانا ہاں۔"

اختر کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ ماتھے پر سلوٹیں اُبھر آئیں اور وہ ہولے ہولے بولا۔

"جانِ من کون سی بنگالن، کون سی پنجابن...... ہم آئیں گے سر کے بل تم حکم دو اور میں نہ آؤں۔"

قہقہے اُٹھے اور پھر دوسری طرف سے فون بند ہو گیا۔

اختر نے مسکرا کر لمبی سی جمائی لی اور نوردین سے مخاطب ہوا۔

"ارے نوردین تم پونچھ میں کیوں نہیں رہتے۔"

"حضور وہاں رہنے سے بال بچوں کا پیٹ نہیں بھرتا۔"

"اچھا اچھا۔"

نوردین خاموشی سے جھاڑ پونچھ کرتا رہا۔

"نوردین تمہارے کتنے بچے ہیں؟"

"حضور دو لڑکیاں ہیں ایک لڑکا ہے۔"

"اچھا اچھا۔"

نوردین نے فون کو صاف کر کے بیڈ لیمپ کے پاس دھر دیا۔

"بچیوں کی شادی ہو گئی ہے؟"

"ابھی کہاں جی۔۔ ۔۔۔ اتنی رقم ہی اکٹھی نہیں ہوتی حضور۔"

سرہانے پڑے ہوئے بٹوے کو کھول کر اختر نے دس روپے اس کی طرف پھینک کر کہا۔ "یہ اپنے گھر بھجوا دینا۔"

"حضور تکلیف نہ کریں جناب۔" نوردین نے نوٹ کی طرف بڑھتے ہوئے بات کی۔

اور جب اختر غسل خانے میں غائب ہو گیا۔ اور اندر سے دروازہ بند کرنے کی آواز آئی تو نوردین نے بستر درست کیا آہستہ سے اختر کا بٹوہ کھولا ایک دس کا نوٹ اور نکالا اور پھر بٹوے کو تکیے تلے رکھ کر باہر چلا گیا۔

شیو کرتے ہوئے اختر کو خیال آ رہا تھا کہ کل شام کتنی طلسمی تھی۔ اس میں بظاہر کچھ بھی نہ تھا۔ اور پھر بھی سب کچھ نہ تھا۔ بالکل اس سفید گلاب کی طرح جو اس کے کوٹ میں بن پاکٹ کے اندر پڑا تھا۔ جس میں اب نہ سفیدی باقی رہی تھی نہ خوشبو۔ لیکن اُسے چھو کر اختر کے جی میں چومنے، چھونے اور گلے سے لگائے رکھنے کی نہ معلوم سی خواہش کروٹیں لینے لگتی تھی اس کے اپنے نظریئے کے مطابق یہ خواہش بالکل وقتی تھی۔ نہ اس میں گہرائی تھی۔ نہ خلوص۔ لیکن یہ تمنا دل کے کسی کونے میں تھی ضرور۔

اسی تمنا نے اسے روبی زمان علی کے گھر جانے سے روک لیا اور وہ کھانا کھانے ڈائیننگ روم میں چلا گیا۔

میزوں پر گلاسوں میں کلف شدہ نیپکن کھڑے تھے۔ ڈائیننگ ہال میں کھانے کے ساتھ ساتھ اونچے طبقے کے پاکستانیوں کے ساتھ بدیشی لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ میزوں پر حسب پسند پاکستانی اور مغربی کھانوں کا آرڈر مل رہا تھا۔ اختر دروازے میں کھڑا ہو گیا اور اس نے ایک کونے سے دوسرے کونے تک نظر دوڑائی۔ صوفیہ کہیں



موجود نہ تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا واپس اپنے کمرے کے سامنے سے گزرا۔ نرم قالین پر اس کے بوٹوں کی دبی دبی آواز، گونج کر بلند ہوئی پھر وہ کمرہ نمبر انیس کے سامنے جا کر رک گیا۔ جی ہی جی میں اس نے دُعا کی کہ کاش صوفیہ اندر موجود ہو پھر ڈرتے ڈرتے اس نے دروازے پر دستک دی۔

اندر سے کوئی آہٹ نہ ہوئی۔

دستک بلند ہو گئی۔

لیکن یوں لگتا تھا۔ جیسے کوئی کمرے میں موجود ہی نہ تھا۔

اس نے دروازے کی KNOB کو ہاتھ میں لیا اور دروازہ کھول کر اندر دیکھا کمرے میں فلٹ کی خوشبو پھیلی تھی۔ اور صوفیہ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس نے آہستہ سے آواز دی۔ "صوفیہ، کزن۔۔ ۔۔ ۔۔ صوفیہ۔"

اس کی آواز نے اُس کا منہ چڑا دیا۔ وہ کپڑوں کی الماری کی طرف بڑھ گیا۔ پھر اس نے دروازے کے پٹ کھولے ہینگروں پر صوفیہ کے کپڑے ٹنگے تھے۔ ابھی کل ہی یہ زرد بلاؤز صوفیہ کے تن پر تھا۔ اس میں سے صوفیہ کے بدن کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اختر نے اس بلاؤز کو اپنی گال سے لگا لیا۔ اور ہولے سے بولا۔ "میری ٹوٹی ہوئی کشتی کو لے کر بھلا تو کہاں لے جائے گی؟"

"رانی! کیا تو اس عاشق کو اپنے سنہری دیس میں لے جانے کا قصد رکھتی ہے؟"

پھر اس نے چوروں کی طرح غسلخانے کی طرف دیکھا۔ اندر کوئی بھی موجود نہ تھا۔ وہ تھکے تھکے قدم اٹھاتا ڈائیننگ روم کی طرف بڑھنے لگا۔ میز قریباً بھر چکے تھے اور کانٹے چمچے کے شور میں ہلکے ہلکے نقرئی قہقہے اور مردوں کی بھاری بھاری آوازوں کا گڈمڈ شور تھا۔

وہ آخری کونے میں پہنچ کر ایک کرسی پر جا بیٹھا اس کے مدِمقابل عینکوں

والا ایک آدمی پورے زور اور نہایت شور کے ساتھ شوربہ پینے میں مشغول تھا۔ اختر نے گلاس میں سے نیپکین نکالا اور اسے گھٹنوں پر رکھ کر مینو پڑھنے لگا۔

"یس سر" سفید کپڑوں میں ملبوس پگڑی کا طرہ نکالے ایک بیرا اُس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

"سوپ مولی گٹانی۔ اور سپاگیٹی"

"اور سویٹ سر؟"

"رولی پولی اور کافی"

"یس سر"

لیکن ابھی اس کا سوپ کچھ باقی تھا۔ جب اس نے نیپکن سے منہ پونچھا۔ اور کٹلس پر ٹکے ہوئے ساتھی سے معذرت مانگ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ دیوار پر ٹنگی ہوئی کسی پاکستانی تصویر پر اس کی نظر پڑی اور اس نے نگاہیں پھیر لیں، سارا ڈائننگ روم اُسے آج پریشان نظر آ رہا تھا۔ پھر جب وہ ہال سے نکلنے والا تھا۔ تو اسے قریب سے آواز آئی "بون جور نو سیئور ۔ ۔ ۔ ۔ بون جور نو"

اس نے نہایت خندہ پیشانی سے اپنی کمر کو خم دیا اور ہاتھ ہلا کر بولا۔

"بون جور نو موسیو۔ بون جور نو مادام"

وہ غیر ملکی جوڑا سر جوڑے ایک ہی پلیٹ میں سے کھانا کھانے میں مشغول تھا اختر نے انھیں الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا کر باہر کا رُخ کیا اور آہستہ آہستہ چلتا اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ پیڈ اور قلم نکال کر اس نے خالدہ کو خط لکھا اور پھر بستر پر لیٹ گیا، جب لیٹے لیٹے شام آنے لگی تو اس نے راکھ دان میں ڈبے کا آخری سگرٹ بجھا کر رکھا اور پھر کمرہ نمبر انیس کی طرف چلا گیا۔

"کون ہے" اندر سے آواز آئی۔



اختر کو یوں محسوس ہوا جیسے ہوٹل کی ساری بتیاں روشن ہو گئیں، کائنات کی رگ رگ میں حسن اور رعنائی کا جنیٹ ہو گیا۔

"میں ہوں کزن!"

اندر سے مکئی کے دانے چٹخنے کی آواز آئی۔

"آؤ کزن"

اندر بتی روشن تھی اور صوفیہ نیچی کرسی پر بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی، اختر نے کمرے میں پہنچ کر دروازے کے ساتھ کمر لگا لی اس وقت وہ بہت دُبلا اور نہایت لمبا رہا تھا۔

"آج تم کہاں رہیں سارا دن"

"میں ایمبسی چلی گئی تھی" اس نے کتاب بند کرتے ہوئے اٹھ کر جواب دیا۔

"ایک تو میرا جی چاہتا ہے کہ اس ایمبسی کو آگ لگا دوں"

"وہ کیوں" وہ پلنگ پر بیٹھی تو سفید ساڑھی کی گود میں لمبی سیاہ چوٹی بل کھا کر بیٹھ گئی۔

"کیونکہ کراچی میں وہی ایک جگہ ہے جس سے تمہیں عشق ہے"

وہ ہنسنے لگی۔

"میں پوچھتا ہوں۔ تمہارا کراچی میں ٹھہرنا کیا ضروری تھا۔ کیا تم ڈھاکہ سے سیدھی لندن نہ جا سکتی تھیں"

وہ نہایت معصومیت سے بولی "جب مجھے سوشل اپ لفٹ والوں نے STI PPEND دیا تھا تو ان کی شرط یہی تھی کہ ڈھاکہ سے لندن کا سفر ہو گا لیکن میں نے بہت جرح کی اور بمشکل تمام کراچی میں کچھ دیر ٹھہرنے کی مہلت لی"

"کیا تین دن کافی نہ تھے"

"کیا معنے؟" اس نے ننھے ننھے ہاتھ بھی گود میں رکھ لئے۔

"یہی چار دن اور لیکن تم کیوں پوچھتے ہو؟"

اختر نے لب کاٹ کر کہا۔ "کیونکہ تین دن کے بعد میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"وہ کیوں؟" وہ گھبرا گئی۔

"تم پوچھ کر کیا لوگی؟"

اس نے سر جھکا لیا اور خاموش ہو گئی۔

اختر نے کتنی ہی دیر اس سکوت کو نہ توڑا اور پھر آہستہ سے بولا۔ "کزن ایک بات مانو گی؟"

"کیا؟"

"چلو پکچر چلتے ہیں۔"

صوفیہ نے بہانہ تلاش کرتے ہوئے کہا۔ "پتہ نہیں آنا نہیں آئی ابھی تک۔"

اختر اس کی طرف بڑھ آیا۔

"پکچر چلو گی میرے ساتھ آنا کے بغیر؟"

صوفیہ اٹھ گئی وہ اس کے مقابلے میں کتنی چھوٹی تھی۔ کتنی نازک۔

"میرے سر میں درد ہے اختر۔"

"تبھی کتاب کا مطالعہ ہو رہا تھا ابھی؟" زہر بھری آواز میں اختر نے پوچھا۔

اختر اس پر جھک کر بولا۔ "چلو گی صوفیہ؟"

"میں نہیں جا سکتی اختر۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"کیوں نہیں جا سکتیں؟ آخر وجہ کیا ہے؟"

"ایسی باتوں کی وجہ نہیں ہوا کرتی۔ اختر۔"

اختر نے اسے دونوں کندھوں سے پکڑ لیا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں وحشت ناچ



رہی تھی۔

"تم اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہو۔ آخر؟"

صوفیہ خاموش رہی اس نے اپنے کندھے چھڑانے کی بھی کوشش نہ کی۔

"اگر میں چاہوں۔ اگر میں چاہوں تو تمہاری مکمل بربادی کا باعث ہو سکتا ہوں لیکن مجھے تم پر ترس آتا ہے۔ واقعی۔"

صوفیہ کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے۔

"تم جیسی ہزاروں لڑکیاں میری اک نظر کرم کی طالب رہی ہیں۔"

صوفیہ نے اس کی جانب کمر کر لی۔

"نرسی آنا ٹھیک کہتی تھی تم نن ہو نن۔ کسی مٹھ میں جا کر کیوں نہیں ٹھہرتیں ایسے مہنگے ہوٹلوں میں کیوں جا ٹھہرتی ہو۔ جہاں کے MANNERS بھی تمہیں نہیں آتے۔"

صوفیہ کے کندھے لرز رہے تھے۔ اور نیچے فرش پر موٹی موٹی بوندیں گر رہی تھیں۔

اختر نے پٹاخ سے دروازہ بند کر دیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا کوری ڈور میں چلنے لگا۔

کوری ڈور سے اُتر کر وہ بھاگنے لگا۔ لفٹ کا انتظار کئے بغیر وہ دو دو سیڑھیاں پھلانگتا نیچے اتر گیا۔ بڑے پھاٹک کے سامنے سٹول بچھائے ہوٹل کا دربان بیٹھا تھا۔ اس نے اختر کو کھڑے ہو کر فوجی انداز میں سلام کیا لیکن وہ ڈگ بھرتا سیڑھیاں اُترتا چلا گیا۔ باہر سمندری ہوا چل رہی تھی۔ اور شام کی ٹریفک جاری ہو گئی۔ اس نے قریب سے گزرنے والی پہلی ٹیکسی روکی اور پچھلا دروازہ کھولتے ہی چلایا۔ "ہاؤسنگ سوسائٹی۔"

ٹیکسی روانہ ہو گئی۔ تو اختر نے ٹیکسی کی پُشت سے ٹیک لگا لی۔ اس کا سانس چڑھا ہوا تھا۔ اور مارے غصے کے نتھنے لرز رہے تھے۔ آج تک کسی لڑکی نے اس کی فرمائش کو بلا وجہ رد نہ کیا تھا۔ اسے یاد بھی نہ پڑتا تھا کہ زندگی میں کسی وقت کسی لڑکی نے

اس کے ساتھ جانے سے انکار کیا ہو، وہ اندر ہی اندر بل کھا رہا تھا۔ کبھی اسے صوفیہ پر غصہ آتا اور کبھی وہ اپنے آپ پر پیچ و تاب کھاتا۔ بھلا ایسی لڑکی کے پیچھے وقت ضائع کرنے کو کوئی چھٹیاں کیے گا۔ پورے تین سال کے بعد اس نے یہ فرصت کا وقت نکالا تھا۔ اور اس میں بھی اس نے خود ہی زہر گھول لیا۔

نہیں پکچر جاتی نہ سہی۔ جہنم واصل ہو مجھے کیا۔

لیکن جوں جوں کار ہاؤسنگ سوسائٹی کی طرف بڑھ رہی تھی، اس کا جی چاہتا تھا کہ آنا کے گھٹنوں پر سر رکھ کر بچوں کی طرح روئے۔ اور کسی بزدل کی طرح شکایت کرے۔ "دیکھو آنا، دیکھو آنا، تمہاری اس نن نے میری توہین کی ہے اس نے میرا دل توڑ دیا ہے آنا۔"

ٹیکسی آہستہ آہستہ لمبی اور کشادہ سڑک پر رواں تھی۔ پھر آنا کے گھر کی پورچ نظر آنے لگی، زرد رو کوٹھی کا ماتھا دکھائی دینے لگا۔ اور بنگلے کے سامنے پر لوہے کے جنگلے والا پھاٹک لمحہ بہ لمحہ قریب آتا گیا۔

"بس رائٹ ہینڈ کی طرف پہلی کوٹھی میں۔"

لیکن جونہی ٹیکسی مڑنے لگی۔ اختر چلایا: "نہیں ڈرائیور سیدھے لے چلو، سیدھے نشاط منزل۔ ہاں۔۔۔۔۔ میں رستہ بتا دوں گا۔"

جب ٹیکسی نشاط منزل کے اندر پہنچی۔ تو روبی پورچ کے سامنے موزیک کی بادامی سیڑھیوں پر کھڑی تھی۔ اس نے سونے کے تاروں سے مڑھی ہوئی فیروزی ساڑھی پہن رکھی تھی اور اس کا دراز قد اس لمحے بہت لمبا دکھائی دے رہا تھا۔

اختر ٹیکسی سے اترا۔ تو روبی نے جھٹ مڑتے ہوئے کہا: "توبہ! دوپہر کا کھانا تھا LAZY BONES رات کا نہیں۔"

اختر اس کے بالکل قریب جا پہنچا۔ اور پشت کی جانب سے اس کے کندھے پکڑ کر بولا: "دوپہر کو تم نے مدعو کیا تھا۔ اب میں تمہیں ساتھ لینے آیا ہوں۔"



ہائے توبہ کرو۔ کس کا دماغ پھرا ہے کہ اپنی سیٹی تمہارے جیسے ذلیل ٹیکسی پر پلید کرے۔"

"روبی اب اگر تم نے کچھ کہا اور میری درخواست رد کی تو قسم میں رو دوں گا۔ بخدا اس وقت میرا بہت جی چاہ رہا ہے رونے کو۔"

"OH, GOD کیسا بن رہا ہے جیسے واقعی رو دے گا۔"

"بخدا اختر دوپہر کو بہت DISAPPOINT رہی۔ وہ مادھوی اپنا ریکارڈ ڈیپ ساتھ لائی تھی۔ اس نے تو اپنے کلچر کے خوب مظاہرے کیے۔"

"تم نے بھی کوئی روک اینڈ رول وغیرہ دکھایا ہے۔"

روبی بشاش ہو کر بولی: "خدا کی قسم اختر ایسی شرمندگی ہوئی۔ جی چاہتا تھا کہ جیتے جی مر جاؤں۔ مادھوی کہنے لگی روبی اب تم بھی کوئی اپنے دیس کا ناچ دکھاؤ۔ میں تو کٹ گئی۔ بھلا اس کے بھارت ناٹیم کے بعد جھنگڑہ دکھاتی کر لڈی۔"

"تم نے کہہ دینا تھا کہ حضت ہمارے کلچر میں سے اورنگ زیبؒ نے ناچ گانے کی بیخ کنی کر دی تھی۔ ہم بے چاریاں اب بھلا کیا ناچیں گی۔"

دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ہنسنے لگے اور دیر تک ہنستے رہے۔

آج روبی کا رنگ بہت دمک رہا تھا۔ لڑکوں کی طرح کٹے ہوئے بال نئے انداز میں سجائے گئے تھے۔ اور اس کا چہرہ ان کی ترتیب سے بہت معصوم نکل آیا تھا۔

"اب ڈیڈی سے ملنے نہ بیٹھ جانا۔ قسم میں اکیلی بور ہو رہی ہوں ایک وہ تینوں گدھیاں فلم دیکھنے چلی گئی ہیں۔"

اختر نے مسکرا کر کہا: "آج نہ تو تمہارے ڈیڈی سے ملنے آیا ہوں نہ تمہاری تینوں بہنوں سے ملنے کی تمنا رکھتا ہوں۔"

روبی اسے ڈرائینگ روم کی طرف لے جاتے ہوئے بولی: "قسم اختر TINA

کو تم دیکھو تو جیتے جی مر جاؤ۔ کوئی قد نکالا ہے اس نے مجھ سے ایک ڈیڑھ انچ لمبی ہوگی۔"

"لمبی ہوگی لیکن تم سا قد نہیں ہو سکتی۔"

تیز تیکھا قہقہہ گونجا اور پھر روبی محل کے نیلے پردے علیحدہ کرتی ہوئی بولی۔ "تو یہ مرد تو خوشامد کے بغیر ایک لمحہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن یہ خوشامد جی کو بہت بھاتی ہے۔ آئیں گے؟"

بتیاں روشن ہوگئیں۔

لمبے ڈرائینگ روم میں ایرانی قالین ایک کنارے سے دوسرے سرے تک پھیلا تھا اور دروازوں کے سامنے جو تھوڑی سی جگہ خالی رہ گئی تھی۔ اس میں سے سیاہ آبنوسی فرش کی چمکدار جلد جھلکیاں دکھا رہی تھی۔

سارے کمرے میں قیمتی صوفے، مہنگی تپائیاں اور دلآویز گلدان سجے تھے۔ پیانو، ریڈیو گرام، ٹیپ ریکارڈ، بدیشی آرٹسٹوں کی بنی ہوئی تصویریں اور کارنس پر چین، اطالیہ اور ہالینڈ کی سوغاتیں سجی ہوئی تھیں۔

اختر رنگین چمڑے سے مڑھی ہوئی ایک گول سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سیٹ نیچے کو دھنس گئی تو اس نے اپنی ٹانگیں قالین پر بچھا دیں اور پھر صوفے پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ "تو پھر شام کا کیا پروگرام ہے؟"

"خاک پروگرام ہے۔ دوپہر کا آرام بھی آج قسمت میں نہ تھا بس گپ شپ میں شام آ گئی۔"

اختر نے مسکرا کر کہا۔ "اور اگر کسی اور کا کوئی پروگرام ہو تو پھر؟"

"GOSH آج تو بہت ٹیڑھی میڑھی باتیں کر رہے ہو حضرت۔"

"روبی بیگم بات یہ ہے کہ میں صبح کی غیر حاضری کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔"

روبی نے ایک جاندار قہقہہ لگایا اور ہنس کر بولی۔ "اب کس کس کوتاہی کی تلافی



کرو گے اس بات کو تو بس رہنے دو۔ تم حسین اتفاق سے IDIOT واقع ہوئے ہو اور یہی تمہارا سارا CHARM ہے۔"

اختر بور ہونے لگا۔ اس کے ذہن میں رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا۔ کہ اگر وہ آنا کے اتر گیا ہوتا تو وہ دونوں مل کر نہایت اچھی شام بسر کر سکتے تھے۔ اگر کبھی کراچی میں اسے صوفیہ نہ ملی ہوتی اور صرف آنا سے ملاقات ہو جاتی تو یہ چھٹیاں کتنی معصوم، کتنی پیاری اور کس قدر یادگار ہو جاتیں۔ لیکن۔

"اللہ! اب یہ چپکے چپکے کیا سوچ رہے ہو؟"

"تمہارے انکار کے مبہم پہلوؤں پر۔"

"انکار... کیسا انکار؟" روبی آگے کو بڑھ آئی۔ بالآخر۔ بالآخر یہ آدمی مجھے پروپوز کرنے لگا ہے اب میری باری ہوگی — روبی نے دل میں کہا۔

"دیکھنا اختر علی خان تمہیں اس تاریخی انداز میں انکار ہوگا کہ تم بھی عمر بھر یاد کرو گے۔ آخر تمہاری حیثیت کیا ہے۔ تمہیں مان کس بات پر ہے؟"

"میرے ساتھ چلو۔ آج ہمارے ہوٹل میں ڈانس نائٹ ہے کوئی کیبرا ڈیبرا بھی ہو رہا ہے۔"

روبی نے نگاہیں جھکا لیں، مایوسی سے اس کا دل ڈوب گیا۔

"مجھے کیبرے ویبرے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ فرنچ اوپیرا کے بعد یہ چیزیں محض نقالی اور فحاشی لگتی ہیں۔"

"لیکن تم اور میں والز کریں گے۔"

"وہ تو گھر پر بھی ہو سکتا ہے۔" آج روبی خوامخواہ اترا رہی تھی۔ اور اب اختر کو غصہ آنے لگا تھا۔

"لیکن یہاں تمہیں اور مجھے ناچتا دیکھ کر ہمیں ADMIRE کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔"

ردبی کا موڈ یک دم ٹھیک ہو گیا۔ وہ ہنستی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی "میں ابھی ذرا تھوڑی دیر میں آئی"۔

یہ تھوڑی دیر جب پون گھنٹے میں بدلنے لگی تو اختر گیلری میں نکلا اور پچھلی طرف لمبی کھڑکیوں والی لائبریری کی طرف چلا گیا۔ اس نے بالکل ہلکی سی دستک دی۔ اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔ تو اختر نے ذرا سا پٹ کھول کر اندر جھانکا۔ عینکوں والی دبلی پتلی ایک بدریشی عورت آقا صاحب کی کرسی کے بازو پر بیٹھی تھی اور ان کے گنجے کے بالوں میں اپنی مرمریں انگلیوں سے کنگھا کر رہی تھی آقا صاحب کا معصوم اور خوبصورت چہرہ بمعہ داڑھی اس کے زانو پر دھرا تھا۔ اور وہ اسے آہستہ آہستہ کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

اختر مسکراتا ہوا دبے پاؤں باہر پورچ میں آ گیا۔

اس کی ٹیکسی گیٹ کے پاس کھڑی تھی۔ گیٹ کے ساتھ دونوں طرف بڑے بڑے سفید چینی کے گولوں میں بتیاں روشن تھیں اور ایسٹر کی باڑھ میں ایک بلی اکیلی آنکھ مچولی کھیلنے میں مشغول تھی۔

"ہو!" پیچھے سے آواز آئی۔

اختر نے مڑ کر دیکھا سرخ ساڑھی میں ردبی ایک شعلہ لگ رہی تھی۔ ایسی خوش شکل اور اس سلیقے سے سجنے والی لڑکی اس نے بہت کم دیکھی تھی۔

"KILLING" اختر نے دل سے کہا۔

تیز اور اونچے قہقہے نے اس لڑکی کے حسن کو کئی درجے کم کر دیا۔

"چلو آؤ ٹیکسی میں چلو۔"

"ارے کیوں اپنی الفا رومیو جو ہے۔ یہ ٹیکسی ویکسی بھیج دو مجھے تو اسے دیکھ کر ہی وحشت ہونے لگتی ہے۔"



جب وہ ٹیکسی کو پیسے ادا کر کے واپس آیا تو پورچ میں سرخ رنگ کی نہایت خوبصورت ٹورسٹر کھڑی تھی۔ ہڈ اترا ہوا تھا۔ اور انجن چلے جا رہا تھا۔

"مجھے آقا صاحب سے ملنا تھا" اختر نے کچھ سوچ کر کہا۔

"ارے چھوڑو، وہ اس وقت بہت مشغول ہوتے ہیں۔"

"مشغول؟"

"بس جو وقت ملتا ہے لائبریری کی نذر ہوتا ہے اب تو انہوں نے لائبریرین بھی رکھ لی ہے۔"

"لائبریرین؟"

"میرا مشورہ تھا۔ بے چارے خود ہی سیڑھیوں پر چڑھ کر کتابیں وتابیں اتارا کرتے تھے میں نے کہا ڈیڈی خوامخواہ جان ہلکان کرتے ہیں مفت میں۔ اچھا مشورہ تھا نا؟"

"بہت اچھا" اختر بولا۔

"تم جاؤ ڈرائیور۔ ہم خود ڈرائیو کریں گے۔ اور جب ٹینا بی بی آئیں تو انہیں کہنا سب کھانا وانا کھا لیں میں ذرا اختر صاحب کے ساتھ گئی ہوں۔"

نہایت چابکدستی اور درشتی کے ساتھ ردبی نے کار کی وہیل گھمائی ایک ہی TURN میں کار سڑک پر فراٹے بھرتی جا رہی تھی۔ ردبی کا پلو کھسک کر بازو پر آ گرا تھا۔ اور بغیر آستینوں والے سنہری بلاؤز میں اس کی باہیں اختر کو شرارت پر اکسا رہی تھیں۔

جب وہ ہوٹل میں پہنچے لوگ کھانا کھانے میں مشغول تھے۔ آج کی رات ڈائننگ ہال کی میزیں ہالے کی صورت میں بچھی تھیں۔ اور درمیان میں لوگوں کے لئے ناچ کرنے کی جگہ چھوڑ دی گئی تھی۔ بینڈ بڑی تیز کوئی آتشیں دھن بجا رہا تھا۔ مادام بوار یا نائیلون کے جالی دار فراک کے نیچے موتیوں کی چولی اور بریف پہنے ہوئے اپنی لمبی ہیل والی

سنہری جوتی درست کر رہی تھی۔

جس وقت اختر اور روبی ہال میں پہنچے وہ دونوں بہت بھلے اور نہایت خوبصورت لگ رہے تھے ہال میں کوئی بھی شخص ایسا تھا جس نے مڑ کر اس جوڑے کو میزوں میں سے جگہ بناتے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے آگے بڑھتے نہ دیکھا ہو۔ سارے ہال میں مدھم مدھم سرخ روشنی پھیلی تھی۔ اور دراز قد روبی جس کا چہرہ بہت معصوم تھا۔ بال لڑکوں کی طرح کٹے تھے۔ گردن اٹھائے یوں چل رہی تھی جیسے اس سرخ کائنات میں ملکہ شعلہ بن کر آگے بڑھ رہی ہو۔

سرخ روشنی میں نہایت زرد چہرہ اٹھا کر صوفیہ نے آنے والے جوڑے کو دیکھا وہ اس سے تین میز ادھر بیٹھ گئے تھے۔ اختر کی پیٹھ اس کی جانب تھی۔ آج وہ پہلے سے کہیں زیادہ لمبا نظر آرہا تھا۔ اور اس کا انداز نشست کہے دیتا تھا کہ اسے دنیا میں کسی کی پرواہ نہیں روبی اور اختر کی آوازیں اس تک پہنچ رہی تھیں۔

"بخدا میں پبلک میں نہیں پیوں گی" روبی نے کہا۔

"دو مارٹینیز۔ بیرا۔ جلدی"

"خدا قسم تم بہت ڈیٹ ہو اگر کہیں ڈیڈی نے دیکھ لیا تو"

"وہ اس وقت کچھ نہیں دیکھ سکتے۔ ان کی لائبریری سلامت رہے"

صوفیہ ہولے ہولے سوپ پیتی رہی۔ اس کا سر دیٹ گود میں سے کھسک کر نیچے قالین پر جا گرا تھا۔ روبی کے ننھے ننھے تیز قہقہے سن کر کئی لوگ مڑ مڑ کر ان کی طرف دیکھتے اور پھر اس خوبصورت جوڑے کی دل ہی دل میں تعریف کرتے ہوئے کھانے کی طرف مائل ہو جاتے۔

"ایک ڈرائی جن۔ اور تمہارے لئے"

"بس بجتی بس"



"ایک ڈرائی جن اور ایک مارٹینی۔ ٹھیک"

ناچ شروع ہو چکا تھا۔ جدھر مادام بوار یا جاتی۔ اس کی طرف سفید سرچ لائٹ کا گول چکر اترا آتا۔ اس کی موتیوں بھری سرخ چولی اور بریف ہلکے ہلکے متحرک رہے تھے اور موتیوں میں سو سو روشنیاں جنم لے کر تماشائیوں کے دل میں جا اترتی تھیں۔

OBSCENE - OBSCENE" روبی نے قہقہہ لگایا۔

"وہسکی سوڈا ......"

صوفیہ کا کھانا اس کے سامنے پڑا تھا۔ اور مادام بوار یا کی لمبی ہیل والی سینڈل تھرک رہی تھی۔ ناچ بہت تیز ہو گیا تھا۔ اور مادام بوار یا اپنی موتیوں والی چولی اور بریف کچھ اس انداز سے تھرکا رہی تھی کہ اوپر پہنا ہوا نائیلون کا گاؤن برائے نام رہ گیا تھا۔ جب وہ چکر لگا کر زمین پر بیٹھ جاتی تو اس کی چمکتی سڈول رانیں اور بے حد متناسب لمبے سفید بازو کچھ اس طرح نمایاں ہو جاتے کہ نظریں ان پر جمی رہ جاتیں۔

"خدا قسم ایسے ناچ نہیں دکھانے چاہئیں بور ...... بور بور ..." روبی نے مادام بوار یا کے نیم عریاں جسم پر نگاہیں جما کر کہا۔

"وہسکی بغیر سوڈا کے۔ اور ایک مارٹینی"

سر دیٹ قالین پر پڑا تھا اور کافی پیالے میں پڑی پڑی ٹھنڈی ہو گئی۔ صوفیہ یہاں سے نکلنے کی راہ سوچ رہی تھی۔ لیکن اب بھری محفل میں سے نکل کر جانا بھی اس کے لئے آسان نہ رہا تھا۔ اختر کی پشت اس کی جانب تھی۔ اور وہ غٹا غٹ پیگ پر پیگ پیے جا رہا تھا۔

مادام بوار یا کے سرخ بالوں پر موتیوں کا بنا ہوا بڑا سا تاج جھول رہا تھا۔ سرخ نائیلون کا ٹخنے ٹخنے برابر گاؤن سفید روشنی میں چکر لگا رہا تھا۔ سنہری ہیل کا ننھا ننھا شور اور قدموں کی تلی جلت پھرت کبھی کبھی سازندوں کے بہت قریب ہو جاتی۔

کبھی وہ صوفیہ کے اس قدر پاس سے گزرتی کہ ہوا میں لہراتا اس کا سرخ رومال صوفیہ کی میز کو چھو چھو جاتا۔

"وہسکی۔"

"بس کرو اختر آؤٹ ہو جاؤ گے IDIOT" روبی نے ہنس کر کہا۔

"تمہاری جیسی لڑکی کے سامنے تو مر جانے کو جی چاہتا ہے تم آؤٹ ہونے کو کہتی ہو۔"

صوفیہ نے نظریں جھکا لیں اسے باہر جانے کا راستہ نہ مل رہا تھا۔

ساز خاموش ہو گئے۔ مادام بوواریا نے بجلی کے پنکھے کی سی تیزی کے ساتھ چند چکر لگائے اور پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ ہال تالیوں سے گونج اٹھا ننھے ننھے قہقہے اور گفتگو کا سلسلہ ایک بار پھر چل نکلا پھر سازوں پر مدھم مدھم تان میں سلو والز شروع ہو گیا۔ کرسیاں کھسکنے لگیں نہایت خوش خلقی کے ساتھ مردوں نے سجی ہوئی عورتوں کو ناچنے پر مجبور کیا۔ اور سرخ قالین پر جوڑے ہولے ہولے رقص کرنے میں مشغول ہو گئے۔

اختر نے اٹھ کر روبی کا ہاتھ پکڑا اسے اپنے جسم سے لپٹایا اور سرخ قالین پر لے آیا۔ صوفیہ نے نظریں جھکا لیں اور باہر جانے کی ترکیب سوچنے لگی۔

ناچنے والے جوڑے آہستہ آہستہ آپس میں گتھے ہوئے گھسر پھسر کرتے ہال کے خالی حصے میں محوِ رقص تھے۔ اختر اور روبی کا جوڑا ناچنے والوں میں بہت نمایاں نظر آ رہا تھا۔ وہ دونوں نہایت اچھا ناچتے تھے۔ جدھر اختر کے قدم جاتے روبی ان قدموں پر یوں اٹھتی جیسے مقناطیس کا لوہا کھینچ رہا ہو۔ سرخ ناخنوں والا روبی کا سفید ہاتھ اختر کے کندھے پر دھرا تھا۔ اور ہولے ہولے بازو پر کھسکتا چلا آ رہا تھا۔

پھر جب صوفیہ کی میز اختر کو نظر آنے لگی تو اس نے روبی کو بالکل اپنے قریب کر لیا۔



"خدا قسم سانس گھٹ گیا ہے میرا ہائے۔" روبی نے ہنس کر کہا۔

اختر کی نظریں اس کے بالوں کو چاٹتی ہوئی اس میز پر گڑی تھیں جس پر ایک چھوٹی سی سانولی لڑکی سفید ساڑھی پہنے بیٹھی تھی۔ اس نے روبی کو اپنے ساتھ بالکل چمٹا لیا اس کی سانس میں سے شراب کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ وہ گھومتے ہوئے صوفیہ کی میز کے پاس آ گئے۔

"ہیلو مس ربیع الدین۔" اختر نے خوش اخلاقی سے ناچتے ہوئے پوچھا۔

"کیا حال ہے آپ کا۔" روبی نے لپ سٹک سے لہولہان دہن ذرا سا کھول کر سوال کیا۔

"سلام علیکم۔" صوفیہ بولی۔

"آپ ناچنا چاہیں، تو آپ کے لئے کوئی پارٹنر تلاش کروں۔" اختر نے پھر طنز بھری آواز میں پوچھا۔

صوفیہ نے پہلی بار نظریں اٹھائیں اس کی آنکھوں میں بارش کی دھمکی تھی "جی میں ناچنا نہیں جانتی۔"

"واقعی۔" روبی نے ہنس کر پوچھا۔

"ارے یہ اولڈ فیشن مسلمان ہیں۔ انہیں ایسی باتوں کی سوجھ بوجھ کہاں۔"

پھر سلو والز پر چل رہے تھے۔ روبی کا چہرہ اختر کی بانہہ سے چھو رہا تھا۔ اختر کی نیلی آنکھوں میں شرارت کی حدت نے بسیرا کر لیا تھا۔ اور اس کے انداز میں ایک گرمی آ گئی تھی۔ جو شام کی اولین گھڑیوں میں موجود نہ تھی۔

صوفیہ اٹھ جانا چاہتی تھی۔ لیکن پتہ نہیں اس کے پیروں کو کیا ہو گیا تھا۔

"کہیں آپ مغربی ناچ کو گناہ و ناہ تو نہیں سمجھتیں مس ربیع الدین۔" روبی نے سوال کیا۔

"مشرقی پاکستان میں مذہب ہے کہاں جو یہ گناہ اور ثواب کو سمجھیں گی۔ وہاں تو چلتا چلتا ہے۔ نمسکار ہوتا ہے۔"

صوفیہ نے منہ پھیر لیا۔ بارش کی بوندیں اس کی پلکوں پر آگئی تھیں۔

اختر، روبی کو گھماتا ہوا آگے لے گیا۔

IDIOT تم نے خوامخواہ اس کا دل دکھایا۔" روبی نے ہولے سے کہا۔

"پیچ نن کر کسی کا دل دکھتا ہے تو دکھا کرے۔"

"بڑے کٹر مذہبی ہوتے ہیں یہ بنگالی میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

اختر نے اس کے بالوں کو پھونک مار کر ماتھے سے پرے کیا اور آہستہ سے بولا۔

"ارے بنگلہ بھاشا میں کیا اسلام ہوگا۔ یہاں پنجاب سے اس کا نام و نشان مٹتا جا رہا ہے وہ تو پھر بھی آدھے ہندو ہیں۔"

روبی کا قہقہہ سازوں کی آواز پر غالب آگیا۔ اور وہ آرکسٹرا کے بہت قریب چلے گئے۔

صوفیہ نے اپنا ننھا سا پرس اٹھایا۔ سُرخ روشنی میں اسے سارا ہوٹل گھومتا نظر آ رہا تھا اس نے آج مغرب کی نماز بھی نہ پڑھی تھی۔ اور اب اس کی طبیعت کچھ ایسی پریشان تھی کہ اسے عشاء کی نماز بھی قضا ہوتی نظر آ رہی تھی اس نے کرسی کو پیچھے کھسکایا اور ننھے ننھے قدم دھرتی باہر چلی گئی۔

اختر کی پیٹھ پر کسی نے ہاتھ رکھا تو روبی چلائی۔ "ہیلو رضا۔"

اختر نے مڑ کر دیکھا ملٹری لباس میں ملبوس کوئی اس سے دو انچ چھوٹا سا نوزائیدہ سا میجر کھڑا تھا۔

"اگر آپ کی اجازت ہو تو میں مس زمان علی کے ساتھ ناچنے کا شرف حاصل کروں میجر رضا؟"

اختر نے روبی کو اور بھی اپنے قریب کر لیا اور ٹھاٹھ سے بولا۔ "آج کی رات تو مشکل ہے۔ دیکھئے آپ کو انتظار کرنا ہوگا۔۔۔ شاید۔۔۔"



میجر رضا علی مایوسی سے گردن جھکا کر واپس چلا گیا۔

وائلن والے کی ہر تان دکھ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جب وہ آگے بڑھ کر ذرا سا کم کو خم دے کر تاروں پر لمبا سا گز کھینچتا تو ناچنے والے جوڑے اور بھی ایک دوسرے کے قریب آ جاتے۔

وہ صوفیہ کی کرسی کے قریب آگئے تو اختر نے روبی کے ماتھے سے سر جوڑ کر اس میز کی جانب دیکھا کرسی خالی تھی اور سفید ساڑھی والی ہرنی جا چکی تھی۔

اختر کی گرفت روبی کی کمر پر ڈھیلی پڑ گئی اس کی سانس جس میں سے شراب کی باس دھونکنی بن کر نکل رہی تھی اب روبی کو اپنے ماتھے پر محسوس نہ ہوئی وہ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔

"تمہارے پاؤں کہاں جا رہے ہیں IDIOT والز ہو رہا ہے سلو والز" روبی نے اسے جھنجھوڑ کر کہا۔

"میں دراصل بہت زیادہ پی گیا ہوں روبی اور اب مجھے ہوش نہیں رہا۔"

روبی نے نازک سا قہقہہ لگایا۔

"بھائی خدارا میرے سامنے آؤٹ نہ ہو جانا۔"

سامنے والی میز پر میجر رضا علی لمبا سگار لئے ٹانگیں قالین پر ٹکائے ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اختر نے روبی کو موڑ کر پشت میجر کی جانب کر لی اور پھر اشارہ سے میجر کو اپنی جانب بلایا۔

"قسم تمہارے پاؤں غلط پڑ رہے ہیں اختر۔" روبی نے پھر تنبیہ کی۔

"لو روبی وہ میجر آ رہا ہے تمہارا پرانا ADMIRER اب تم اس کے ساتھ ناچو ورنہ میں تمہارے ساتھ قالین پر اوندھا جا گروں گا۔"

میجر نے سر جھکا کر اختر کا شکریہ ادا کیا اور پھر بڑے تکلف سے روبی کا ہاتھ پکڑ کر چلا گیا۔ اختر صوفیہ کی خالی کرسی پر جا بیٹھا۔ سرخ روشنی میں ناچنے والے تمام جوڑے مدھم پڑ چکے تھے۔ صرف قالین پر ایک سرویٹ گرا ہوا تھا اور وہ جا چکی تھی۔ وہ جس کا دل دکھانے میں اس نے آج کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ خاموشی سے چلی گئی۔ اس نے ایک بار بھی اختر کی طرف ناراضگی کے ساتھ نہ دیکھا تھا۔ کیونکہ اس کا دل سمندر تھا۔ اور اختر۔ اختر تو محض ایک ٹوٹی ہوئی کشتی تھی جو موجوں پر ادھر ادھر تیرا کرتی ہے۔ جس کشتی میں کوئی ناخدا نہیں ہوتا جس کے پتوار شکستہ ہوتے ہیں اور جس کے بادبانوں کے چیتھڑے اتھاتی سمندری ہوائیں قہقہے لگاتی ہیں اور جب ایسی کشتی میں سوراخ ہو جایا کرتے ہیں تو یہی سمندر آغوش بڑھا کر دامن پھیلا کر اسے سمیٹ لیتا ہے اور پھر کبھی کشتی ادھر اُدھر ڈولتی نہیں پھرتی نہیں کبھی خشک ساحلوں کی تلاش میں نہیں بھٹکتی کبھی ریتیلے کناروں کی تمنا نہیں کرتی۔

اختر نے اپنا ماتھا میز پر رکھ دیا سامنے ابھی تک ایک پیالے میں کافی دھری تھی۔ اس کی نظر ساتھ والی کرسی پر پڑی اس کرسی کی سیٹ پر ایک نیلا لفافہ پڑا تھا۔

بلیک اینڈ وائٹ کی بوتل آدھی ہو چکی تھی۔

ڈائننگ ہال میں سے اب کیبرے کی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں لیکن اختر کی آنکھوں سے نیند غائب تھی۔ بیڈ لیمپ کی مدھم روشنی اس کے تکئے۔ فون اور آرام کرسی کے ارد گرد ہالہ بنا رہی تھی۔ اس روشنی میں ہر بار وہ نیلے کاغذ کو کھول کر دیکھا۔ اس کی تحریر پڑھتا۔ اور پھر بلیک اینڈ وائٹ کی سیاہ بوتل منہ سے لگا لیتا خط اردو میں صوفیہ کے نام رقم تھا۔

بیٹی صوفیہ سلامت رہو!

کل تمہارا خط ملا تھا۔ اسی وقت خط کا جواب لکھتی لیکن تمہارے والد نے مشاعرہ



کروا رکھا تھا۔ شیدا صاحب کے چند شاگرد حسن اتفاق سے یہاں آ گئے تھے سو ان سے ملاقات ہوئی اور مشاعرے کی محفل نے تمہاری کمی کو بہت محسوس کیا۔ اگر تم ہوتیں تو ایسے باذوق لوگوں کی محفل سے ضرور محظوظ ہوتیں۔ اور کچھ اپنے کلام کی اصلاح کے لئے تمہیں مدد مل جاتی بہرکیف میں نے تمہارا مسودہ، چراغاں صاحب کو دکھایا وہ پڑھ کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے ایک بنگالی لڑکی کے لئے ایسی اُردو لکھنا اور پھر اس میں شاعری کرنا باعث صد افتخار ہے۔"

کل علی مرتضیٰ صاحب بھی آئے تھے تمہارا ایڈریس مانگ رہے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ کورس پاس کرنے کے بعد تمہیں بنگالی اکیڈیمی میں ترجمے وغیرہ کے لئے لگنا چاہیئے۔ لیکن بیٹا میں نے تمہارا پتہ نہیں دیا۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ تم انہیں ان کے خط کا جواب نہ دو گی۔ پھر انہیں گلہ ہو گا۔

تمہیں یہ سفر مبارک ہو صوفیہ بیٹی۔ لیکن جب میں رات کو بیٹھ کر سوچتی ہوں کہ اتنا بڑا مغرب ہے اور تم اکیلی ہو، تو میرا دل خوف سے دھڑکنے لگتا ہے تم نے میرا مشورہ نہیں مانا میری تمنا تھی کہ کاش تم کراچی نہ ٹھہرتیں۔ بخدا میں خرچ کی وجہ سے نہیں کہتی تم نے خود محنت کی اور روپیہ جمع کیا۔ لیکن سوچتی ہوں کہ خدا جانے کیسا ہوٹل ہے وہاں رہنے والے کیسے ہیں تمہیں میں نے لوگوں کی نظروں سے بچا بچا کر پالا ہے کہیں کوئی بدبخت تمہارا دل نہ دکھا دے تمہیں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔

میں نے تجھے اللہ اور رسولؐ کے سپرد کیا ہے صوفیہ میری دعائیں تیرے ساتھ ہیں۔

پریشان:۔
تمہاری والدہ

کراچی شہر رات کے پچھلے پہر میں اونگھ گیا تھا اور اب ہوٹل کے سامنے والی سڑک کا ٹریفک بہت کم ہو گیا تھا۔ اکا دکا کار نکلتی تو اس کی آواز رات کے اس سناٹے میں آوارہ ڈائین کی کراہ بن جاتی۔

اختر نے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیئے خط کو لفافے میں بند کیا اور پھر اپنے ریشمی ڈریسنگ گاؤن کی ڈوریاں باندھتا ہوا باہر نکل گیا۔ سرخ قالین سو رہا تھا ہوٹل کے کمروں میں سے خراٹوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ ایک ایک قدم پر رکتا وہ کمرہ نمبر انیس کی طرف نکلا۔ ایک بوڑھی عورت سفید بالوں پر دھوتی کا پلو لئے اس کے سامنے کھڑی تھی اور کہہ رہی تھی۔ میں نے اسے لوگوں کی نظروں سے بچا بچا کر پالا ہے کہیں کوئی بدبخت اس کا دل نہ دکھا دے۔

نیچے سڑک پر سناٹے کو چیرتی ایک کار نکل گئی اور سنسناتی ہواؤں نے پوچھا علی مرتضیٰ، علی مرتضیٰ کون ہے؟ اور صوفیہ اس کے خطوں کا جواب کیوں نہیں دیتی بھلا۔

اختر نے صوفیہ کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔

اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔

اس بار دستک اونچی ہو گئی تو کسی نے پوچھا "کون ہے؟"

یہ آواز صوفیہ کی آواز سے بہت مختلف تھی۔ جیسے رندھے ہوئے گلے سے آنسوؤں کو پی کر کوئی بولنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"میں ہوں اختر۔ صوفیہ؟"

دروازہ نہ کھلا۔

اس نے دروازے کے ساتھ منہ لگا لیا اور آہستہ سے بولا "صوفیہ، صوفیہ! تمہارا جی نہیں چاہتا تو دروازہ نہ کھولو۔ لیکن مجھے معاف کر دو۔ ایک بار، صرف آخری بار۔"

اندر سے زبردستی سسکیوں نے دروازہ کھولنا چاہا۔



"سنو صوفیہ! میں تمہارا خط لوٹانے آیا ہوں۔ تمہاری والدہ کا خط میں تمہارا دل نہیں دکھا سکتا صوفیہ۔"

ساری بلیک اینڈ وائٹ جیسے پانی تھا۔ ذرا بھی اختر کو اس کا نشہ محسوس نہ ہو رہا تھا اس کے پیروں میں کسی نے کیلیں ٹھونک دی تھیں۔ اور وہ دروازہ کے ساتھ گال لگا کر کھڑا تھا۔ دراز قد نگین و فور غم سے کانپتا ہوا۔

دروازہ آہستہ سے کھلا۔ اس طرح جیسے کوئی بلی اپنے گزرنے کے لئے راہ بنا رہی ہو۔ اندر بیڈ لیمپ روشن تھی۔

صوفیہ نے جلدی میں ساڑھی اپنے گرد لپیٹ لی تھی۔ پلو کے کونے سے چابیوں کا چھوٹا سا گچھا بندھا تھا۔ اس کے بال کھلے اور کندھوں پر پڑے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں کے پپوٹے سوجے نظر آتے تھے۔ اور گالوں پر آنسوؤں کے داغ تھے۔

"مجھے معاف کر سکتی ہو صوفیہ؟" اختر نے خط اس کی طرف بڑھا کر پوچھا۔

"بولو۔ صوفیہ بولو؟"

صوفیہ نے نگاہیں جھکا لیں۔

اختر اس کی طرف بڑھ آیا۔ وہ قد میں اس سے کتنی چھوٹی تھی۔ کتنی دبلی پتلی اور کتنی نازک۔ "صوفیہ میں۔۔۔ ۔۔۔ میں۔"

صوفیہ آہستہ سے بولی "بھلا میں آپ کو کس بات کی معافی دوں۔"

اختر اس کے کندھے پر جھک گیا۔ یہ بال کتنے سیاہ تھے درختوں کی چھاؤں کی طرح آرام دہ۔

بس تم کہہ دو میں نے معاف کیا۔ پھر میں چلا جاؤں گا۔ کہو گی تو میں کراچی چھوڑ دوں گا۔

صوفیہ کے ہاتھ اس کے بالوں میں ڈوب گئے۔ لمحہ بھر کے لئے اختر کا ماتھا اس کی گردن کو چومتا رہا۔ پھر صوفیہ نے اس کا سر کندھے سے اٹھایا اور بولی۔

"رات بہت بیت گئی ہے۔ اب سو جاؤ۔"

سارے کمرے میں شراب کی تیز باس پھیلی تھی۔

"یہاں سو جاؤں۔ تمہاری کرسی پر" اختر نے اشارہ کر کے پوچھا۔

صوفیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تمہیں ڈر نہیں۔ میں نشہ میں دھت ہوں" اختر نے پوچھا۔

صوفیہ مسکرائی۔ ہنسی کے ہموار دانت روشنی میں جگمگا اٹھے اس نے پلنگ پر بیٹھ کر کہا "کوئی پھولوں سے بھی ڈرتا ہے۔ بگڑے پھولوں سے۔ ضدی بچوں سے۔"

پھر وہ واقعی چپ چاپ اپنے پلنگ پر لیٹ گئی خاموشی کے ساتھ۔ اس نے اختر کی جانب پشت کر لی۔ اور اس کے لمبے لمبے بال سارے تکیے پر پھیل گئے۔

اختر تھوڑی دیر کرسی پر بیٹھا رہا۔ پھر اس نے اٹھ کر صوفیہ پر کمبل ڈال دیا۔ اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

باہر صبح کی سفیدی زور مار رہی تھیں۔

اختر کو احساس ہوا جیسے وہ کسی مسجد سے فجر کی نماز پڑھ کر نکلا ہو۔

آنا فون پر چیخ رہی تھی۔ "کیوں کر ہو سکتا ہے کہ تم ہوائی جہاز پر چڑھانے نہ آؤ۔ کیا اس دیس سے ہمیں الوداع کہنے والا کوئی نہ ہوگا۔"

اس نے چونگا اپنے کان سے ذرا پرے کیا اور تحمل سے بولا: "لیکن آنا میں سیٹ بک کروا چکا ہوں۔"

"کب کی؟" سوال ہوا۔

"کل کی۔"



"ایک پرسوں کا دن نہیں ٹھہر سکتے ہمارے لئے پرسوں شام ہم روانہ ہوں گی۔"

اختر کے گلے میں ریت پھنس گئی۔

"پرسوں کے لئے ٹھہرنا میرے لئے قطعی ناممکن ہے آنا۔"

آنا پھر چلائی "میں آ رہی ہوں۔ ابھی وہ نن کہاں ہے؟"

"ڈائننگ ہال میں۔ چائے پی رہی ہے۔"

"بس میں ابھی پہنچوں گی۔ ابھی یہی آدھ گھنٹے میں۔"

"میں بھی وہیں ہوگا۔"

"چاؤ اختر۔"

"چاؤ آنا۔"

ڈائننگ روم میں بہت کم لوگ تھے۔ اختر رات کا جاگا ہوا تھا۔ اور اس کے چہرے پر بے خوابی کے اثرات چھائے تھے۔ دن چڑھتے ہی وہ سٹیشن گیا تھا اور اپنی سیٹ بک کروا کر واپس آیا تھا۔ صبح کے چند گھنٹے جب ہوٹل کے تمام لوگ سوئے ہوئے تھے اور وہ جانتا تھا کہ صوفیہ کا دروازہ اندر سے مقفل نہیں اس نے ہوٹل کے لمبے کوری ڈور میں ٹہلتے گزار دیئے تھے۔ جوں جوں سفیدی شیشے لگی کھڑکیوں سے ٹکراتی وہ سوچتا۔ ابھی اسی لمحہ مجھے کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔ ورنہ آج صبح..... آج کا دن میرے لئے بہت خطرناک ہے وہ سارا مستقبل جو میں اپنے لئے پلان کر چکا ہوں خاک میں مل جائے گا۔

گھومتے پھرتے آخری بار اس نے ترازو میں اپنی تمناؤں کو تولا اور فیصلہ کیا کہ صوفیہ کے ساتھ زندگی گزارنے کا عزم وہ پلان ہے جو بچے ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھنے کے سلسلے میں بنایا کرتے ہیں۔ خالدہ، بنگلہ، کار، شراب، کلب بھلا زندگی کی کس کس کشش کی چھبن وہ بھلا سکے گا۔ وہ تمام راحتیں جن سے اب اس کا وجود عادی

ہو چکا تھا۔ ان راستوں کے بغیر اسے صوفیہ کا خالی خولی وجود کیا سُکھ دے سکے گا۔ لاہور میں اپنے چچا چچی تھے اپنا طبقہ تھا۔ اپنے معیار کے لوگ تھے اور بالفرض وہ صوفیہ کو ان لوگوں میں لے بھی جائے۔ تو اس سادی اجنبی دلہن کا چچا کے گھر میں کیا خیر مقدم ہو گا؟

خالدہ کے سہارے جس گھر کا وہ مالک ہو سکتا ہے کیا خالدہ کے بغیر وہاں اس کی اجنبی کو کوئی پوچھے گا۔ شوناردیس سے آئی ہوئی ہرنی سی دلہن۔ نازک دلہن جس کے پاؤں فرش پر اس طرح پڑتے ہیں گویا وہ کنول کے پھولوں پر چل رہی ہے۔

چہرے پر گھونگھٹ کے بغیر ادھا سا سنگار لئے آنکھوں میں چاندنی کی کرنیں بھیجے جب اجنبی ملک کی یہ دلہن میرے گھر میں پہنچے گی تو قومی برتری، نسلی امتیاز کے عادی، امارت اور دولت کے نشہ میں سرشار اس کی سیرت کو اس کی موہنی کو کیا سمجھیں گے؟

اور پھر یہ باتیں تو چھوڑیئے جناب اختر علی خان صاحب! ذرا لمحہ بھر کے لئے سوچیئے آپ کے ہاتھ جس انداز سے روپیہ خرچنے کے عادی ہیں۔ روپیہ نے جو جو راہیں آپ کے لئے کھولی ہیں جس جس طرح آپ کی زندگی سہل بنائی ہے کیا آپ بالیٹرے موڈ کی جذباتیت میں اس ساری سہولت کو کھو دیں گے اور محض اک خیالی تصور کی خاطر اپنی ساری زندگی تباہ کر لیں گے۔ اور ایسی راہوں پر چل دیں گے جو آپ کے لئے بالکل اجنبی، نہایت دشوار گزار اور بے حد انجانی ہیں۔

جب صبح کی پیشانی کو سورج دیوتا نے چوما تو رات کی ساری جذباتیت کھوکھلی اور بیگانہ ہو چکی تھی۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچ چکا تھا کہ بہرکیف اب اسی میں عافیت ہے کہ میں ایسی ملاقاتوں کو طول دیئے بغیر یہاں سے جلد از جلد روانہ ہو جاؤں وہ بغیر ٹیو کے سوٹ پہن کر نیچے اترا اور ٹیکسی لے کر سٹیشن پہنچ گیا۔ ایئرکنڈیشن کوچ میں چار دنوں کے لئے کوئی سیٹ نہ ملی لیکن وہ اس وقت تھرڈ کلاس میں بھی لاہور پہنچنے کو تیار تھا



ہوائی جہاز سے وہ سفر کرنا نہ چاہتا تھا۔ بہرکیف اسے اب اپنے گھر کی عافیت درکار تھی۔ اس گھر میں رائج معیار اور ان اصولوں کے بغیر اس کی زندگی بے سہارا تھی قطعی بے سہارا۔

ٹکٹ خریدنے کے بعد اس نے خالدہ کو اپنے پہنچنے کی تار دی اور پھر واپس ہوٹل آ گیا۔

اتنا بڑا فیصلہ کر چکنے کے بعد اس کی طبیعت ہلکی ہو رہی تھی۔

آنا کا فون بند کرنے کے بعد اس نے اپنے تمام کپڑے الماری میں سے اٹھائے اور انہیں بستر پر ڈال کر کہا: "ابھی واپسی پر آ کر سامان باندھوں گا فی الحال.... فی الحال آخری بار صوفیہ کے ساتھ ناشتہ کرنا باقی ہے۔"

ہال میں بہت کم لوگ تھے۔ رات کی سُرخی اور بوجھل فضا کا نام و نشان باقی نہ تھا ساری میزوں پر ہلکے بسنتی رنگ کے میز پوش بچھے تھے۔ اور دیوار پر لگی ہوئی تصویر صبح کی روشنی میں بہت تازہ اور بارونق لگ رہی تھی۔

"ناراض تو نہیں ہو نا؟" اختر نے اس کے پاس کرسی کھینچ کر پوچھا۔

"آخر کوئی وجہ بھی تو ہو؟"

"میں نے جان بوجھ کر تمہاری بے عزتی کی تھی کل۔ تمہارے مذہب پر حملہ کیا تھا۔"

صوفیہ نے ہنس کر کہا: "مذہب پر۔ تو ہمارے مذہب کیا وہ ہیں کہ تم حملہ کرتے۔"

"پھر بھی ہمارے یہاں کے لوگ تو کچھ یہی سمجھتے ہیں کہ...." اختر رک گیا۔

صوفیہ نے سر جھکا کر بڑی افسردگی سے کہا: "اسی سمجھ کے پھیرنے تو اتنے فاصلے قائم کر دیئے ہیں۔"

"میں ان کے حصے کی بھی تم سے معافی چاہتا ہوں۔"

گھنٹی کے دانے بجنے کی آواز آئی۔

"اور میں ملکۂ بنگال اپنے لوگوں کی طرف سے تم سب کو معاف کرتی ہوں۔"

وہ اپنے کمرے میں سے ارادہ کرکے آیا تھا کہ صوفیہ سے ملتے ہی اسے اطلاع دے گا کہ وہ کل لاہور جا رہا ہے لیکن ملکۂ بنگال کو یوں ہنستا دیکھ کر ہمت جواب دے گئی۔

صوفیہ نے چائے کی پیالی بنا کر اختر کی طرف بڑھائی اس پیالی میں اسے عجب شیرینی سی گھلی ہوئی محسوس ہوئی۔

"پتہ ہے اختر ہمارا وطن تو ایک ہے لیکن فاصلے نے عجب NOTIONS ایک دوسرے کے متعلق پھیلا رکھے ہیں۔"

"واقعی!"

وہ اس کی سیاہ کشادہ آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔ بھلا کون کہتا تھا کہ بنگال کا جادو اب نہیں چلتا۔

"ہمارے ہاں بھی تو لوگوں کے متعلق عجب عجب باتیں مشہور ہیں۔"

"مثلاً——؟" اختر نے پوچھا۔

لیکن اب تو میرا نظریہ بن چکا ہے اب مجھے وہ باتیں مہمل لگتی ہیں۔"

"مثلاً اب تمہارا ہم لوگوں کے متعلق کیا خیال ہے؟"

وہ ہنس کر بولی: "تم لوگ لمبے ہو، گورے ہو۔ اور کبھی پیٹھ کی طرف سے حملہ نہیں کرتے۔"

اختر کے جی میں، جیسے کسی نے گھونسہ مارا۔

اسے وہ سفید ساڑھی میں ملبوس یاد آگئی جس پر چھانے کا اس نے پورا عزم کیا تھا۔

بیرا چاندی کے ٹرے میں ایک خط لئے اختر کے پاس آگیا اختر نے خط اٹھایا اور بلاوجہ ایک روپیہ چاندی کی طشتری میں رکھ دیا۔

سفید لفافے کو میز پر رکھ کر اختر نے لمبی جمائی لی۔ رات کی نیند ہوتے ہوئے اس کی



طرف رینگ رہی تھی۔

"آپ بہت زیادہ ٹپ کرتے ہیں اختر۔"

"ہوں۔"

"بہت زیادہ ٹپ دی ہے آپ نے۔" اس نے پھر کہا۔

"دو دنی دینے کا میں قائل نہیں۔" اس نے ہنس کر جواب دیا۔

صوفیہ نے سر جھکا لیا اور ہنس کر بولی: "آپ جیسے لوگ متوسط طبقے کے لئے زندگی کتنی مشکل کر دیتے ہیں۔ اگر آپ کی تقلید کریں تو جیب یہ بوجھ برداشت نہیں کر سکتی اگر نہ کریں۔ تو سفید پوشی اندر سے چٹکیاں کاٹتی ہے۔"

اختر اس کے ننھے ننھے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا۔ بھلا علی مرتضیٰ کون ہے۔"

وہ ان ہاتھوں کے لکھے ہوئے خطوں کا بھلا اس قدر مشتاق کیوں ہے۔

"آپ نے خط پڑھا ہے؟" صوفیہ بولی۔

"چچا جان کا خط ہے۔ ابھی پڑھ لوں گا۔"

"پڑھ لیجئے پہلے——"

وہ آہستہ آہستہ چائے پینے لگی۔

اختر نے خط پڑھا اور پھر اسے میز پر پھینک کر بولا: "عجب مصیبت ہے میں یہاں چھٹیوں پر آیا تھا۔ اب کام پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہے۔"

وہ خاموشی سے مسکراتی رہی۔

اختر نے خط اس کی طرف پھینک کر کہا: "دیکھ لو اگر ایک دن میں ختم ہونے والا کام بھی ہو تو بھی بات ہے۔"

صوفیہ نے بغیر پڑھے خط اس کی طرف لوٹا دیا۔

اب اگر میں اس وقت بیٹھ بابو والا کے پاس جاؤں تو سارا دن خراب ہو جائے گا۔"

"بھلا وہاں کیوں جانا ہے؟" صوفیہ نے بالآخر پوچھا۔

"ہمارا کچھ کاغذ آنے والا ہے آج کل میں اور جو کوٹیشنز ہم نے انہیں بھیجی ہیں۔ مال اس قیمت پر ڈیلیور نہیں ہو گا۔"

"یعنی؟"

"یعنی وہ تو محض EYE WASH ہے محض کاروباری دھوکہ۔ اصل قیمت تو وہ ہے جو چچا نے مقرر کی ہے۔"

وہ حیران ہو کر اس کی صورت تکنے لگی۔

"میرا چہرہ کیا دیکھ رہی ہو؟"

"تم واقعی بلیک مارکیٹ کرتے ہو؟ واقعی؟" صوفیہ نے پوچھا۔

"میں کوئی انوکھا اس مرض میں مبتلا ہوں کیا۔ سارا زمانہ کرتا ہے۔ ساری دنیا کرتی ہے"

صوفیہ نے سر جھکا لیا اور بولی "کرتی ہو گی لیکن جی نہیں چاہتا کہ اپنے جاننے والے بھی اس لعنت میں گرفتار ہوں۔"

"لعنت کیسی GET RICH QUICK کا آج تو بس یہی طریقہ رہ گیا ہے صوفیہ"

"لیکن بھلا دولت کی ایسی ضرورت بھی کیا ہے؟" اس نے سادگی سے پوچھا۔

"تو زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے میں بھی کونسی بھلائی ہے؟"

وہ خاموشی سے چائے پیتی رہی۔

بڑی دیر کے بعد وہ آہستہ سے بولی "واقعی اختر زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنے کی ہوس عجیب راہیں سجھایا کرتی ہے پچھلے سال مجھے بھی بڑی آزمائش کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ان دنوں میرے والد کا ایک دوست مچھلی پکڑنے کا سامان اور پیرے خرید رہا تھا۔ انہوں نے میرے والد سے بھی کہا کچھ سا جھا ڈال لیں۔ زندگی کو بہتر بنانے کا یہ نہایت سنہری



موقع تھا۔ نہایت سنہری۔"

"پھر۔ پھر انہوں نے SHARE ڈالا کہ نہیں؟"

"انہوں نے مجھ سے اس بات کا ذکر کیا۔ میں ان دنوں ایک مقامی مدرسہ میں ہیڈ مسٹریس تھی اور میرے پاس کچھ فنڈز تھے۔"

"اچھا ہیڈ مسٹریس بھی رہ چکی ہیں جناب۔"

وہ ہنس دی اور کہنے لگی "جی ہاں زندگی کی دوڑ میں بڑھنے کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ صرف بلیک مارکیٹ نہیں کی۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ میرے پاس سرکاری پیسہ تھا۔ برسات کی چھٹیاں بھی قریب تھیں اور میں اگر اس روپے کو استعمال کر لیتی تو تین ماہ کے بعد آسانی سے واپس لوٹا سکتی تھی۔ نہ کسی کو علم ہوتا نہ کچھ۔"

"پھر؟"

"اس روز سکول کا آخری دن تھا۔ اباجی کا رقعہ میرے پاس دھرا تھا جس میں دو ہزار روپے انہوں نے منگوائے تھے۔ ایک ہزار میرے بنک میں موجود تھا۔ ایک ہزار سکول کے فنڈ میں پھر اختر مجھ پر عجیب کیفیت طاری ہوئی تم BALLU (CINATUIN) کو جانتے ہو نا۔ جانتے ہو؟"

"اب جاؤں گا لاہور جا کر" اختر نے اسے گہری نظروں سے ٹٹول کر کہا۔

وہ ہنس کر بولی "مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے میرا وہم ہے لیکن سچ اختر جب میں نے سکول کے فنڈ کا چیک کاٹا اور اس پر دستخط کرنے تو مجھے لگا دفتر کے دروازے میں سے کسی نے میری طرف دیکھا میں نے مڑ کر نظر کی تو....."

"تو...؟"

"تو صدر ایوب کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر صدیوں کا کرب تھا۔ اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں صوفیہ! صوفیہ جب تم جیسی لڑکیاں ایسا کریں گی۔ تو پھر ہم اور ول سے

کیا توقع کریں گے۔

"تم صدر ایوب سے بہت متاثر ہو؟" اختر نے زہر خند کے ساتھ پوچھا۔

"کیوں بھلے لوگوں سے متاثر ہونا کیا کوئی معیوب بات ہے؟"

"لیڈر کبھی بھلے نہیں ہوتے۔ صوفیہ بیگم"

جب شیشے میں کھڑا درویش غائب ہو گیا۔ اور میں نے چیک پھاڑ دیا تو سامنے والی دیوار پر لگا ہوا کیلنڈر پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اور اس پر بنی ہوئی فیلڈ مارشل ایوب کی تصویر میں اس کرب کا رتی بھر بھی موجود نہ تھا جو میں نے کھلی آنکھوں دیکھا تھا۔

"لڑکیاں عام طور پر کھلی آنکھوں زیادہ خواب دیکھا کرتی ہیں لیکن وہ لیڈروں سے متعلق نہیں ہوتے۔"

"اس نے نظریں جھکالیں اور بولی" سوائے لیڈر رہی نہ سمجھتا ہو۔ پھر" اختر نے جھک کر اس کی طرف دیکھا اور بڑی طنز بھری مسکراہٹ سے پوچھا۔

"اور جناب والا اسے کیا سمجھتی ہیں؟"

صوفیہ نے کندھے جھٹکے اور ننھے ننھے ہاتھ میز پر رکھ کر بولی "اختر تم مذاق سمجھتے ہو۔ میری باتوں کو شاید۔ لیکن مجھے تو وہ اپنی قوم کا نجات دہندہ لگتا ہے پتہ نہیں کیوں مجھے یوں لگتا ہے جیسے وہ اتنا HONEST اتنا ایماندار ہو کہ کبھی کبھی اس ایمانداری کی اسے بہت قیمت ادا کرنی پڑتی ہو گی۔"

اختر نے ذرا سا حسد محسوس کیا اور چڑ کر بولا "لیڈروں کے پیچھے یوں دیوانی ہونے والی لڑکیوں کا انجام عموماً جیل ہوتا ہے۔"

وہ ہنس دی۔ مکئی کے دانے چٹخے اور پھر اس نے بڑی خوش خلقی سے کہا "جیل وغیرہ تو کسی POSITIVE قسم کی شخصیت کے لئے ہوتی ہے ہم جیسی لڑکیاں تو بس سوچتی ہیں اور بغیر کچھ کئے اپنی اپنی زندگی بتانے جاتی ہیں۔ کاش ہماری سوچ کبھی



افعال کا روپ بھی دھار سکتی۔"

آنا ڈائیننگ ہال کے بھرے پر برآمد ہو گئی۔ اس نے گہرے بنتی رنگ کا سکرٹ اور اسی کا ہم رنگ بلاؤز پہن رکھا تھا۔ پیروں میں بغیر ہیل کی بالکل سپاٹ جوتیاں تھیں۔ اور بال دو چھوٹی چھوٹی چوٹیوں میں بندھے سینے پر پڑے تھے۔ اس وقت وہ دسویں جماعت کی ایسی لڑکی لگ رہی تھی جو دسویں میں بھی غلطی سے داخل ہو گئی ہو۔

"چاؤ" اس نے دروازے پر پہنچتے ہی کہا۔

"چاؤ آنا" اختر نے لمبا سا ہاتھ ہلا کر کہا۔

صوفیہ کے چہرے پر عجب سکون تھا۔ اور اس سکون پر بار بار ایک اطمینان بھری مسکراہٹ یوں بکھر جاتی جیسے کھلے دروازے میں سمندری ہوا کے جھونکے۔

"بدبخت کل تم کہاں تھے سارا دن؟" آنا آتے ہی بولی۔

"تم کہاں تھیں سارا دن؟"

"میں یہاں آئی تھی شام کو۔ پوچھ لو ان سے۔"

ان نے اثبات میں سر ہلایا۔

اختر نے جی میں سوچا اگر کہیں میں تھوڑی دیر ٹھہر جاتا۔ اور زمان علی کے گھر نہ جاتا۔ تورات والا واقعہ کتنی آسانی سے ۸۷۵۱۵ کیا جا سکتا تھا کتنی آسانی سے سامنے بیٹھی آنا بالکل سکول گرل لگ رہی تھی۔ اور ٹانگ پر ٹانگ دھرے مزے سے ٹانگیں ہلا رہی تھی۔

"آنا۔ آج تو مجھے یقین نہیں آتا کہ تم نے تین سال ایمبیسی میں کام کیا ہے؟"

"پوچھ لو اطالوی ہائی کمشن سے۔ غضب کا کام کرتی تھی۔ غضب کا کام کرتی تھی غضب کا۔ کبھی ایک فائل میز پر چھوڑ کر گھر نہیں آئی۔"

"تو اب جا کیوں رہی ہو؟"

آنا نے مسکرا کر کہا۔ "اپنے فدن ساتو کی تلاش میں اور کیا؟"

"تجھے کہاں فدن ساتو ملے گا۔ خوامخواہ کی خوش فہمی ہے۔"

آنا نے پھر پیری لی اور سینے پر صلیب کا نشان بنا کر بولی "خدا قسم اختر اس وقت منحوس باتیں نہ کرو۔ کبھی کبھی ایسی باتیں سچ ہو جایا کرتی ہیں۔"

صوفیہ خاموشی سے چائے پی رہی تھی۔ اور اس کے چہرے سے مسکراہٹوں کے جھونکے ٹکرا رہے تھے۔

آنا نے جلدی سے اطالوی میں ایک گندی سی گالی دیکر پوچھا۔ "اور یہ تم کل کیوں جا رہے ہو کم بخت؟"

صوفیہ نے پیالہ واپس رکھ دیا۔ اس کی آنکھیں بہت کشادہ ہو گئیں۔ وہ خواب میں ڈر گئی تھی۔

"بس مجھے جانا ہے۔ میں پرسوں کا دن یہاں نہ ٹھہروں گا۔"

صوفیہ نے منہ پرے پھیر لیا۔ اس کی آنکھوں میں بارش کی دھمکی تھی۔

"کیوں۔ ؟"

"بس مجھے کام ہے۔"

"یہ بھی کوئی بات ہے۔ تمہاری کزن کو بھلا ایئرپورٹ پر کون الوداع کہنے آئے گا۔"

"مجھے تو خیر کچھ دوست ملنے آہی جائیں گے۔"

"کزن کے ساتھ اس کی دوست جو ہے۔"

"لیکن پھر بھی یہ انتہائی بدتمیزی ہے تم ایک دن بھی نہیں ٹھہر سکتے۔" اس کی چوٹیاں سینے پر گھڑی کے لنگن کی طرح ہلنے لگی۔

"نہیں ـــــ بھئی۔"

"وجہ ؟"



"کئی ایسی باتیں ہوتی ہیں جن کی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔"

صوفیہ کا چہرہ جھکا ہوا تھا۔ اور وہ لب کاٹ رہی تھی۔

"پنجاب کے لوگ ہوتے ہی UNREASONABLE ہیں۔" وہ میز پر ہاتھ مار کر بولی۔

صوفیہ کے چہرے پر سے ساری مسکراہٹیں غائب ہو چکی تھیں۔ سارا سکون بارش کی دھمکی نے چاٹ لیا تھا۔ وہ منہ پرے کئے بیٹھی تھی جیسے یہاں سے بھاگ جانے کی راہ ڈھونڈ رہی ہو۔ اختر کے جی میں لمحہ بھر کو آئی کہ وہ جا کر اپنی سیٹ کینسل کروا دے۔ لیکن پھر اس نے سوچا یہ چھٹیوں کا موڈ ہے اس پر میں گہری جذباتیت کا فیصلے نہیں کروں گا۔

"ہمارے ساتھ چلو ذرا کلفٹن چلتے ہیں۔" آنا بولی۔

"کلفٹن۔" اختر نے سوچا۔ کلفٹن چلوں ان کے ساتھ؟ تاکہ یادوں کے تازیانے اور کوڑیالے ہو جائیں؟

تاکہ۔۔۔ ۔۔۔ تاکہ سیٹ کینسل کروانے کے کچھ اور امکانات بڑھ جائیں اور سنہری مستقبل کی تصویر اور دھندلی ہو جائے۔ کبھی نہیں۔ اب تو میں ان کے ساتھ ایک لمحہ بھی نہ گزاروں گا ایک لمحہ بھی۔

پھر اس نے آنا کی طرف رُخ کیا اور کہا "ابھی تو مجھے سیٹھ بابو والا کے پاس جانا ہے۔"

"وہ کیوں ؟"

صوفیہ آہستہ سے اُردو میں بولی "بلیک مارکیٹ والی بات بتلانے کی حماقت نہ کرنا۔ یہ لوگ بڑے محب الوطن ہوتے ہیں۔"

اختر نے بڑے جوش سے کہا "ذرا سا کام ہے۔"

"کام کر کے آجانا وہاں۔"

"اچھا کوشش کروں گا۔ لیکن وعدہ نہیں۔ صرف کوشش۔"

آنا چڑ کر بولی "اچھا تو نہ آنا۔ یہاں کون مرا جاتا ہے۔ ہاک، یہ کس قدر نخرہ ہو گیا ہے اس آدمی کو۔"

"اچھا۔ تو اب میں چلوں۔"

"جاؤ جاؤ منع کون کرتا ہے۔ روکتا کون ہے۔" آنا نے منہ پھیر لیا۔

"آؤ صوفیہ ہم دونوں سمندر کنارے چلتے ہیں۔"

صوفیہ نے نظریں اٹھا کر اختر کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولی "کاش کی اگر آپ کو کم قیمت ملے گی۔ تو کیا آپ کو بہت نقصان ہو گا۔"

"ارے نقصان نہیں ہوتا صوفیہ۔۔ ۔۔ لیکن ویسے نفع سے گزارہ بھی نہیں ہوتا"

صوفیہ نے نظریں جھکا لیں اور بڑی پژمردہ آواز میں کہا۔ کاش! کاش آپ کی حرکات قومی مفاد کے اس قدر منافی نہ ہوتیں۔"

اختر نے ہاتھ ہلایا اور بڑے تپاک سے بولا "چاؤ آنا۔"

آنا نے منہ پرے رکھا اور خاموش رہی۔

وہ آنا پر جھکا اور دونوں چوٹیاں پکڑ کر بولا "چاؤ سکول گرل۔"

آنا یوں ہنسی جیسے غبارہ پھٹ گیا۔ اور لمبی سی گالی اطالوی میں دے کر بولی۔

"خدا قسم تم ساتھ چلتے تو بڑا مزہ ملتا۔"

"مجھے کام ہے بچے۔ چاؤ آنا۔ چاؤ صوفیہ۔"

بغیر ان کی طرف دیکھے وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔

بندر روڈ کی بڑی دکان پر جب تیسری سیڑھی پر اس کے قدم پڑے اور بابو والا کے بورڈ پر اس کی نظر گئی تو پتہ نہیں اس کے جی کو کیا ہو گیا۔ اس نے سوچا اور کچھ تو میں صوفیہ کے لئے کر نہیں سکتا کم از کم اس کی اس چھوٹی سی خواہش کا احترام



تو کر سکتا ہوں۔ بابو والا سے چچا خود لین دین کر لیں گے۔ ہاں یہ بات ضرور تھی کہ اگر زبانی سودا طے ہو جاتا تو کسی قسم کا خطرہ نہ ہوتا اور پھر دام بھی اپنی مرضی کے ملتے لیکن خیر کم از کم یہ تو میری تفریح کے دن ہیں۔ تین سال کے بعد شادی کے بندھنوں سے ذرا پہلے میں آخری چھٹیاں گزارنے یہاں آیا ہوں۔ کم از کم یہ بزنس سے پاک ہونی چاہئیں۔

وہ سیڑھیوں سے اترا اور ٹیکسی میں جا کر بیٹھ گیا۔

اختر خوب جانتا تھا کہ آنا اور صوفیہ کلفٹن کے ریتیلے ساحل پر اس کا انتظار کر رہی ہوں گی لیکن وہ سیدھا ہوٹل واپس آگیا۔ یہ جگہ اب اسے گھر کی طرح مانوس لگ رہی تھی، اور وہ ریشم کے کیڑے کی طرح کونے میں گھس کر بیٹھ جانا چاہتا تھا۔ اسے ہر لحظہ اپنے وجود سے ایک عجیب طرح کا خطرہ پیدا ہو جاتا۔ یہ خطرہ اسے سٹیشن پر جا کر ٹکٹ واپس موڑنے کی تلقین کرتا اس وقت اختر کو اپنے سنہری مستقبل کا آبار شہر گرتا ہوا نظر آتا۔

سرخ قالین پر بڑے بڑے قدم دھرتا وہ سیدھا بے خیالی میں انیس نمبر کمرے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ ابھی رات وہ اپنے ساتھ تیز وہسکی کی خوشبو لایا تھا۔ اس وقت دن کا چڑھا سورج کمرے کی دہلیز کو چوم رہا تھا۔ اور سارے میں فلیٹ کی باس پھیلی تھی اختر نے جی میں سوچا کہ شاید وہ کلفٹن نہ گئی ہو۔ شاید وہ اندر ہی ہو۔ اور اس خیال کے آتے ہی وہ اپنے کمرے کی طرف چلنے لگا اگر وہ اندر ہے تو مجھے کسی قیمت پر اندر نہ جانا چاہئے۔ میرے سنہری مستقبل کی تمام بنیادیں کھوکھلی ہو جائیں گی۔ خالدہ کے گلے میں باہیں ڈالنے کی بجائے خدا جانے میں کہاں جا پہنچوں گا۔

بنگلہ، کار، کلب اور جیب میں بڑی سی چیک بک۔ توبہ! توبہ!!۔

اپنے کمرے میں واپس آ کر اس نے گھڑی پر نظر ڈالی لنچ کا وقت گزر چکا تھا۔ اور بستر پر اس کے کپڑے بڑے سلیقے سے تہہ کئے پڑے تھے۔ نور دین اس کی غیر موجودگی

میں کمرے کی صفائی کر کے جا چکا تھا۔ بیڈ لیمپ کے پاس ابھی تک رات والی بلیک اینڈ وائٹ کی بوتل پڑی تھی۔ رات جب وہ کمرے میں سے نکلا تو اس میں تھوڑی سی شراب باقی تھی۔ لیکن اب بوتل بالکل خالی تھی۔

اختر نے آرام کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ سلگالی اُسے رہ رہ کر خیال آرہا تھا کس طرح اس نے کباب پکائے تھے اور جب قیمہ فرائینگ پین میں سے اُچھل اُچھل کر باہر پڑتا تھا۔ تو وہ الماری کے پاس کھڑی ہنستی تھی اور بس ہنسے ہی چلی جاتی تھی۔

اس طرح بغیر ریڈ روز کے اس نے پھر کبھی صوفیہ کو نہ دیکھا۔

اختر نے سگریٹ پیر تلے مسل دیا قالین کے بال جلنے کی تھوڑی سی خوشبو اٹھی اور پھر تازہ فلٹ کئے ہوئے کمرے کی باس میں مل گئی۔

اختر نے اپنا فایبر کا سوٹ کیس نکالا اور طے شدہ کپڑے اٹھا اٹھا کر اندر بند کرنے لگا۔ اسے یوں لگ رہا تھا۔ وہ خواب میں اپنا وطن چھوڑ کر کہیں پردیس جا رہا ہے رنگین تائیاں لینن کی قمیضیں خوبصورت جوڑے سوٹ کیس میں اترنے لگے۔ لیکن جب اس نے گرے سمر کا سوٹ بند کرنا چاہا۔ تو اس کا ہاتھ کوٹ کی اوپر والی جیب میں چلا گیا۔

ایک زرد اور مرجھایا ہوا پھول اُس کی ہتھیلی میں آگیا۔ اس کی جلد اب براؤن ہو چکی تھی۔ اور پتیاں کاغذی تھیں۔ اختر نے اسے بوسہ دیا تو جلے ہوئے لونگ کی خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی وہ سکول گرل نہ بننا چاہتا تھا۔ لیکن پتہ نہیں کیوں آج اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ایسے آنسو ایک بار تب بھی اس کی آنکھوں میں آئے تھے جب وہ بہت چھوٹا تھا۔ اور ایک روز اس کی پھوپھی نے کہا تھا: "اب بیٹا تم سیانے ہو اپنی چچی کو اماں نہ کہا کرو۔"

"کیوں پھوپھی جی؟"

"کیوں کہ یہ تمہاری اماں نہیں ہیں۔"



اس نے حیران ہو کر پوچھا تھا: "اور میری اماں کہاں ہیں؟"

"وہ تو جب تم چھوٹے تھے تب ہی مر گئی تھیں۔"

وہ جانتا تھا کہ چچا اس کے ابا نہیں ہیں لیکن چچی میں بھی ماں کو نہ پا کر وہ نڈھال ہو گیا۔ بھی کچھ تو موجود تھا وہی حالات تھے۔ لیکن آنسو اس کے ٹکنے کو جھگوتے رہے تھے ایسے ہی انجانے دکھ کا ذکر آنا نے بھی تو کیا تھا۔ ایسا دکھ جو پہلی محبت اور پہلی مایوسی میں ملا کرتا ہے۔

پھر اس نے گلاب کے پھول کو کوٹ کی جیب میں ڈال کر سوچا لیکن یہ کہاں کی عقلمندی ہے یہ کوئی میری پہلی محبت ہے آدھے لاہور کی آدھی قبول صورت لڑکیاں میرے لبوں سے پیار کے بول سن چکی ہیں۔ پھر یہ کیسی خود فریبی ہے گلاب کی خوشبو نے اس سے پوچھا۔ اختر کہیں یہ کہیں آخری محبت کی تو نہیں؟ آخری محبت زندگی کا آخری تحفہ ہوا کرتی ہے اسی کی یاد لے کر انسان قبر میں جاتا ہے۔ اور اسی کے ساتھ روزِ محشر اُٹھے گا۔

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے چونگا اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا اسے علم تھا کہ سوائے روبی کے اس وقت اور کوئی فون نہیں کر سکتا اور اس وقت وہ روبی سے باتیں کرنے کے موڈ میں نہ تھا۔

شام آگئی لیکن وہ کمرے سے نہ نکلا۔ کئی بار اس کے جی میں آیا کہ انیس نمبر کمرے تک چلا جائے لیکن دروازے تک جا کر وہ پھر واپس آ کر بیٹھ جاتا۔ اور اپنے جی سے کہتا بس یہی ایک دن عزم دکھانے کا ہے آج کا دن گزر گیا تو پھر لاہور ہو گا۔ اور پچھلی مایوسیوں کی طرح اس مایوسی کا تعلق بھی محض ایک یاد رہ جائے گا۔ اور میں کسی روز بیٹھ کر خالدہ سے کہوں گا: "شکر کرو خالدہ میں کراچی سے واپس آگیا۔ ورنہ وہاں تو ایک احمقانہ حرکت کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔ اتنا قریب پہنچ گیا تھا۔ اتنا قریب کہ لاہور مجھے چاند سے بھی پرے نظر آتا تھا۔"

اس کا سارا سامان بندھ چکا تھا۔ بلیک اینڈ وایٹ کی بوتل ردی کی ٹوکری میں پڑی تھی۔ میز پر دو ٹرے موجود تھا۔ جس میں سے اس نے شام کو چائے پی تھی۔ وہ کسی قیمت پر کمرے سے نکلنا نہ چاہتا تھا۔ اگر ریشم کا کیڑا اپنا کریا چھوڑ کر نکلا تو خدا جانے کیا ہو جائے۔ چائے کے ایسے تین ٹرے نور دین اسے پہنچا چکا تھا۔ اور وہ خاموشی سے رات پڑنے کا انتظار کر رہا تھا۔

پھر رات آجائے گی۔ اور میں سو جاؤں گا۔ اور کل۔ . . . کل صبح مجھے رخصت ہو جانا ہے۔ حسین دیسوں میں سب سے حسین دیس پنجاب کی طرف روانگی۔ اور وہاں لاہور کے سٹیشن پر خالدہ آئی ہوگی۔ اس نے نائیلون کی کوئی بھڑکیلی ساڑھی پہن رکھی ہوگی۔ پٹھانوں کی خوبرو لڑکی کے چہرے پر اوپر کو اٹھی ہوئی سیاہ عینکیں ہوں گی اور لبوں پر آتشیں لپ اسٹک ہوگی۔ آنے جانے والے مسافر اور قلی اس کی طرف للچائی نظروں سے دیکھیں گے اور جیسے یہ نظریں اس لمبے چوڑے قصیدے کے اشعار ہوں گے جو اس کی شان میں کہا گیا ہو۔ پھر سفید گردن کو جھٹکا دے کر وہ مجھے دیکھتے ہی پوچھے گی ”نائی لیکس لائے ہو اختر؟“

اور جب وہ محسوس کرے گا کہ بکس میں سب رنگ موجود ہیں تو وہ للچائی ہوئی نظروں کے ساتھ اس سے بغلگیر ہو جائے گی۔ اور اس کے بازو کا سہارا لئے وہ سٹیشن سے یوں روانہ ہوگی جیسے بیوٹی کمپیٹیشن میں فرسٹ آئی ہو۔

لیکن شام رینگ رہی تھی۔ اور سگریٹوں کا ڈبہ ختم ہو چکا تھا۔ اختر خاموشی سے اٹھا اور چور نظروں سے کوری ڈور کو دیکھتا ہوا لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔

رات آگئی تھی۔ لیکن اس نے نہ تو دوپہر کا کھانا کھایا تھا۔ اور نہ ہی وہ رات کو ڈائننگ ہال میں گیا۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں صوفیہ اسے ہال میں مل نہ جائے وہ کسی قیمت پر اسے علیحدگی میں نہ ملنا چاہتا تھا۔ سگریٹ پی کر اب اس کے حلق میں جلن ہونے لگی تھی۔ اور آواز بیٹھ گئی تھی۔



پھر اس نے فون اٹھایا اور آنا کا نمبر ملایا۔

”کون؟“ نیند میں ڈوبی ہوئی آواز نے پوچھا۔

”میں ہوں اختر۔ اختر آنا!“

”دفع ہو جاؤ!“

”ٹھہرو ٹھہرو فون بند نہ کرنا۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے!“

آنا نے جوش سے کہا ”اگر کچھ کہنا تھا۔ تو کلفٹن کیوں نہ آگئے!“

”اس لئے کہ مجھے اپنے آپ سے ڈر لگتا تھا آنا اس لئے!“

”کیوں؟“ اس نے جلدی سے پوچھا۔

آنا جب تمہیں برورانیتو تیو سے محبت ہوئی تھی۔ تو تمہیں اپنے آپ سے ڈر لگتا تھا۔

”ہاں لگتا تو تھا۔ لیکن تمہیں کس سے محبت ہو گئی ہے؟“

”آنا۔ میرا ایک کام کرو گی؟“

”ہاں کر دوں گی۔ لیکن مجھ سے کوئی ڈالر وغیرہ نہ مانگنا۔ تم سے پہلے میں کئی لوگوں سے وعدہ کر چکی ہوں!“

اختر کے گلے میں روئی پھنس گئی۔

”بس تم سٹیشن پر نہ آنا کل۔ میں تمہارے اور صوفیہ کے سامنے گاڑی پر چڑھنا نہیں چاہتا!“

”وہ کیوں؟“

”بس مجھے اپنے آپ سے ڈر آ رہا ہے آنا!“ دوسری طرف خاموشی رہی۔

”نہیں آؤ گی نا؟“

”نہیں آؤں گی۔ لیکن بھئی تم لوگ بڑے FUNNY ہو تم بھی اور صوفیہ بھی!“

اس نے حیران ہو کر اپنے آپ سے کہا۔

”اس نے کیا کیا ہے؟“

آنا جلدی جلدی بولی: "کل جب ہم کلفٹن کی ریت پر پھر رہی تھیں۔ تو کہنے لگی آنا! اگر میں راہ میں مرجاؤں تو میرا ایک کام کردو گی؟"

"کیا؟"

"ہاں کہنے لگی اگر میں مرجاؤں تو میری لاش لاہور بھجوا دینا!"

"لاہور؟"

"ہاں آں کہنے لگی لاہور بھجوا دینا۔ میں نے پوچھا ڈھاکہ کیوں نہیں۔ تو کہنے لگی میری ماں غم سے مرجائے گی۔"

اختر کے ہاتھ میں چونگا کانپنے لگا۔

"اور میری بات بھی یاد رکھو گی؟"

"ہاں!"

"سٹیشن پر نہ آنا۔ نہ تم نہ صوفیہ؟"

وہ اطالوی میں کچھ کہنے لگی۔ تیز تیز اور بے ربط جملے۔

"چاؤ آنا؟" اس کی آواز میں آنسو تھے۔

"چاؤ اختر۔"

"اپنے فدان ساتو کولے کر ڈھاکہ ضرور جانا وہ دنیا کا خوبصورت ترین شہر ہے۔"

"اور تم صوفیہ کولے کر روم ضرور آنا۔ ہر راستہ روم ہی تو جاتا ہے۔ اچھا!"

اختر کے گلے میں نمکینی سی محسوس ہونے لگی۔

"چاؤ آنا!"

"چاؤ اختر۔"

"چاؤ آنا۔ تمہارے دیس پر سلامتی ہو!"

فون بند ہوگیا۔

اس کا سر گھوم رہا تھا۔ اپنی نعش کو لاہور بھجوانے والی لڑکی سے بغیر ملے وہ کیسے



کراچی سے رخصت ہو سکتا تھا۔ بھلا ایک دوالوداعی جملے کہنے سے کیا ہو جائے گا۔ یوں کمرے میں چھپ کر بیٹھ رہنا کون سی دلیری ہے۔ اور پھر اب تو ٹکٹ بھی خریدا جا چکا ہے۔

اس نے سگریٹ بجھا دیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ سمندری ہوا کے جھونکے نے اُسے نکلتے ہی باہنوں میں لے لیا۔ سرخ قالین پر ٹہلتے ٹہلتے جب اس کے پیر تھک گئے تو اس نے کمرہ نمبر ۱۹ کے دروازے کو آہستہ سے کھٹکھٹایا۔

رات بہت جا چکی تھی۔ اور ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں سے مادام بواریا کے رقص کا میوزک اب بہت ہلکا ہو چکا تھا۔ کبھی کبھی جب وائلن کی تان اونچی پڑتی تو صوفیہ کے دروازے سے ٹکراتی۔ اور چھوٹی سی درز میں سے اسے چونکا دیتی۔

کمرے میں صرف بیڈ لیمپ روشن تھا۔ اور اس کی روشنی اختر کے پیروں اور گھٹنوں میں سے ہو کر نیم اُجالے میں بدل جاتی تھی۔ وہ دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ انہیں اس طرح بیٹھے جیسے کئی صدیاں، کئی قرن گزر چکے تھے۔ صوفیہ اس کے بہت قریب تھی۔ اتنی قریب کہ اگر وہ چاہتا تو بازو بڑھا کر اس کا سارا وجود لپیٹ سکتا تھا۔ اس کی لمبی چوٹی کئی بل کھا کر سفید ساڑھی پر پڑی تھی۔ اور وہ دونوں ہاتھوں سے پلو کے دھاگے نکالے جا رہی تھی۔ ان ہاتھوں سے، ان بالوں سے جدا ہونا اختر کے لئے کتنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہی لڑکی جس پر چھا جانے کا اس نے عہد کیا تھا۔ اب بغیر کسی مدافعت کے اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ اور اس میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ اس کے پلو کے گرے ہوئے وہ دھاگے ہی اُٹھا لیتا جنہیں صوفیہ نے چھوا تھا۔ زندگی نے اس سے بڑا مذاق اس سے بڑی چال سازی آج تک نہ کی تھی۔

"تمہیں ڈر نہیں آتا صوفیہ؟" بالآخر اس نے پوچھا۔

"کیا ڈر؟" اس کی آواز جیسے گھاٹ پار سے آئی۔

"رات ہے۔ ہوٹل ہے اور تمہارے کمرے میں ہم دونوں تنہا ہیں؟"

وہ مسکرا دی۔ سیاہ آنکھوں کا سحر اور بڑھ گیا۔

"اگر مجھے تم سے کوئی ڈر ہوتا۔ تو میں تمہیں اپنے کمرے میں آنے ہی نہ دیتی"

اختر نے منہ پرے کر لیا اور ایک بار وہ دونوں پھر خاموشی میں ڈوب گئے۔ اختر نے سوچا شاید لاہور پہنچ کر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن میں لاہور پہنچ بھی جاؤں گا؟ سنا ہے لوگ بیٹھے بیٹھے مر بھی جایا کرتے ہیں۔ یونہی بلاوجہ یہ سکول گرلش جذباتیت ہے۔ اس نے جی کو سمجھایا سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ایسی لڑکی میرے مشاہدے میں نہیں آئی تھی، اس لئے دھچکا شدید ہے۔ لیکن میں اسے بھی بھول جاؤں گا۔ اور پھر خالدہ ہوگی۔۔ ۔۔۔ اپنا بنگلہ ہوگا۔ کار ہوگی اور کلب۔ کلب کی لڑکیاں مجھے دل کی دھڑکن کہہ کر میری VANITY کا سامان بہم پہنچایا کریں گی"

لیکن ان لڑکیوں کا HEART THROB بننے سے حاصل؟

کیا یہ درد میرے ساتھ جائے گا؟

کیا سفید گلاب کے پھول دیکھ کر ہمیشہ میری آنکھوں میں آنسو آجائیں گے۔ کیا؟ کیا؟

صوفیہ اسی طرح بیٹھی ساڑھی کے پلو میں سے دھاگے نکال رہی تھی۔

اختر نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر اس نے فیصلہ کیا کہ اگر وہ اسی طرح بیٹھا رہا تو شاید اس کا سارا روشن مستقبل اس کے سارے پروگرام خاک میں مل جائیں اور وہ ان تمام آسائشوں سے محروم ہو جائے۔ جو اس نے اپنے لئے حلال کر رکھی ہیں۔ جنہیں اگر خالدہ کا سہارا نہ ملا۔ تو وہ یتیم بچوں کی طرح ہمیشہ اس کے کپڑے نوچتی رہا کریں گی۔

اسے کھڑا ہوتے دیکھ کر دھاگے کھینچتے ہاتھ رک گئے لیکن صوفیہ نے اس کی طرف نہ دیکھا۔ وہ اسی طرح سر جھکائے بیٹھی رہی۔

"تم پرسوں انگلستان کا جہاز لوگی" اس نے معمولی سی آواز میں کہا۔ صوفیہ خاموش رہی۔



"اور میں کل صبح کراچی چھوڑ جاؤں گا" اس کے حلق میں کوئی چیز اٹکی ہوئی تھی وہ اب بھی خاموش رہی۔

اختر دوبارہ کرسی کے بازو پر بیٹھ گیا۔ اس کے لئے الوداعی جملے ادا کرنے بہت مشکل ہو رہے تھے۔

"آنا کہتی تھی کہ جب تم واپس آؤ گی تو تبدیل ہو چکی ہو گی"

صوفیہ نے بغیر آنکھیں اٹھائے کہا "انسان کے اندر اگر تبدیل ہونے کی تمنا نہ ہو تو ماحول اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا"

پھر اختر نے ہاتھ بڑھا کر اس کی لمبی سی چوٹی اپنے دائیں ہاتھ میں اٹھالی۔ یہ بال نہایت نرم، سیدھے اور چکیلے تھے۔

"صوفیہ ایک بات کہوں۔ مانو گی؟"

پہلی بار صوفیہ نے آنکھیں اٹھائیں اس کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔ اور آنکھیں سرخ تھیں۔

"مانو گی میری بات صوفیہ"

اس نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔

"آنا کہتی ہے یہ۔۔ ۔۔ یہ بال نہ کٹوانا صوفیہ"

صوفیہ نے سر جھکا لیا۔ ناگن اس کے ہاتھ سے پھسل کر صوفیہ کے گھٹنے پر جا گری۔

"یہ مشرق کا سمبل ہیں۔ اور۔۔ ۔۔ ۔۔ اور"

"تمہیں اچھے لگتے ہیں" اس نے سر جھکائے ہوئے پوچھا۔

اختر کے حلق میں روئی پھنس گئی۔ اس نے روہانسا ہو کر کہا "اسی لئے تو کہتا ہوں"

صوفیہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کی طرف پشت کر کے بولی "تو پھر کیسے کٹوا سکتی ہوں"

گہری خاموشی پھر کمرے پر چھا گئی۔

بہت دیر بعد صوفیہ نے اس کی طرف مڑتے ہوئے کہا: "میری بھی ایک بات مانو گے اختر؟"

اختر کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا کہیں اس کی تمنا میرے مستقبل کے منافی ہوئی۔ تو؟ کہیں لاہور جانا ممکن ہی نہ رہا تب؟ اس نے اعتماد سے بھرے انداز میں سر ہلا کر آہستہ سے کہا۔ "کوشش کروں گا۔۔۔۔"

صوفیہ کا چہرہ تمتایا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ اور آنکھوں میں موسلا دھار بارش کی پہلی دھمکی تھی: "لاہور جا کر بلیک مارکیٹ نہ کرنا اختر۔"

اختر یکدم کھڑا ہو گیا وہ اس سے قد میں کتنی چھوٹی تھی۔ کتنی نازک۔ چچا کا کاروبار پھیلا ہوا تھا۔ اس کی تو بنیاد ہی بلیک مارکیٹ پر تھی۔ ایک ایک پلیٹ بنانے کے وہ کتنے ہی روپے زائد لگا لیا کرتے تھے ایک ایک رم کاغذ پر انہیں کتنی آمدنی ہو جاتی تھی۔ فارن کتابیں، کاغذ، پریس کا کام ایک چکر تھا۔ ایک چکر جس میں تمام SPOKES ہی بلیک مارکیٹ کی بنی ہوئی تھیں۔ اگر یہ سپوکس موجود نہ رہیں تو بھلا یہ چکر کیوں کر چل سکے گا۔ ان کی زندگی کی تمام آسائشیں کیا ہوں گی۔

"تمہیں بلیک مارکیٹ سے بہت نفرت ہے کیا؟" اس نے صوفیہ سے پوچھا۔

"اگر بلیک مارکیٹ تمہیں نفع پہنچاتا اور کسی کا نقصان نہ کرتا تو شاید میں اسے گوارا کر لیتی۔ لیکن۔۔۔ ۔۔۔"

اختر نے اسے کا یک بنا کر سمجھایا: "صوفیہ ہمارے بلیک مارکیٹ سے کسی کو نقصان نہیں پہنچتا۔ ہم اُن سے زائد رقم وصول کرتے ہیں جن کے پاس بلیک مارکیٹ ہی سے کمایا ہوا وافر روپیہ جمع ہے۔ یہ وافر روپیہ کبھی میری جیب میں آ جاتا ہے اور کبھی ان کی گرہ میں چلا جاتا ہے۔"

صوفیہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس کی آنکھوں میں سے نمی غائب ہو چکی تھی۔

"تم سمجھتے ہو ایک گرہ کٹ جب دوسرے جیب کترے کا نقصان کر سکتا ہے تو کرے



لیکن میں اس انسان کے لئے کہہ رہی ہوں جو تمہارے سارے نفع میں سے پائی کا بھی حقدار نہیں۔ کہیں نہ کہیں اُس کی حق تلفی ہو جاتی ہے۔ تم اپنی آسائشوں کو کس کی قربانی دے کر خرید رہے ہو۔ شاید تمہیں اس کا علم نہیں ہے۔"

اختر خاموش رہا۔ اس وقت یہ دھان پان سی لڑکی اسے ایک چٹان کی طرح سخت نظر آ رہی تھی۔

"انسان کب تک اپنی آسائشوں کے لئے اپنے برگزیدہ آدمیوں کی قربانی دیتا رہے گا۔ اپنی قوم سے محبت کرنے والے کا کیا یہی اجر ہونا چاہیئے۔ معمولی لوگوں کے ساتھ کیا ایسے ہی ہونا چاہیئے؟"

اختر کا جی چاہا کہ آہستہ سے کہے صوفیہ قوم پر مرنے والے ہر لیڈر کی زندگی ڈھونگ کے سہارے گزرتی ہے۔ وہ قربانی قربانی پکارتا ہمیشہ دوسروں کے لہو کا حساب ہو جایا کرتا ہے۔ لیکن پتہ نہیں آج اسے اپنے ذہن کی اس بات پر اعتبار نہ رہا تھا۔ نہ ہی اس کی زبان ساتھ دے رہی تھی۔

صوفیہ کہہ رہی تھی: "اختر کیا انسان نے ایک مسیح کا خون بہا کر سبق نہیں سیکھا؟ کیا اپنی من مانی کرنے والے ہمیشہ اپنے چاہنے والوں کو مصلوب کیا کریں گے۔"

اختر اس دیوانی سکول گرل سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن وہ اس کی طرف بڑھ آئی اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ اور آنکھوں میں پھر موسلا دھار بارش کی دھمکی تھی۔ اس نے اختر کو دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"تم دیکھتے نہیں اختر کانٹوں کا تاج پہنے وہ چلا جا رہا ہے۔ چلا جا رہا ہے تم اسے اس کے انجام سے نہیں بچاؤ گے۔ تم اسے ان لوگوں کے ہاتھوں سے نہیں بچاؤ گے جو اپنی آسائشوں کی خاطر اپنے نجات دہندہ کو صلیب پر چڑھا دیا کرتے ہیں۔ بولو اختر بولو۔"

اختر نے آہستہ سے کہا "میں کوشش کروں گا صوفیہ۔"

صوفیہ نے اس کے بازو چھوڑ دیئے اور ڈوبی ہوئی آواز میں بولی "اگر تم وعدہ کر لیتے تو مجھے کوئی غم نہ رہتا اور میں آسانی سے یہاں سے چلی جاتی۔"

اختر نے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں اس کا چہرہ اٹھا کر پوچھا "کوئی غم نہ رہتا صوفیہ کوئی غم بھی نہ رہتا؟"

صوفیہ نے جلدی سے اس کی طرف پیٹھ کر لی اور آنسو اس کی آواز پر غالب آ گئے۔ نیچے موزیک کے گرے اور سیاہ فرش پر بارش کی پہلی بوندیں برسنے لگیں۔

"اب تم چلے جاؤ۔ اختر چلے جاؤ۔"

"صوفیہ!"

"اب چلے جاؤ اختر!"

"مجھے سٹیشن پر چھوڑنے آؤ گی؟"

صوفیہ نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا اور مسکرا کر بولی "کوشش کروں گی۔"

لیکن اس کی ساری مسکراہٹ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بارش میں بہہ گئی۔

اختر نے باہر نکل کر دروازہ بند کیا تو اسے محسوس ہوا وہ تحت الثریٰ میں اترتا چلا جا رہا ہے۔

گاڑی فراٹے بھرتی لاہور کی طرف جا رہی تھی۔

ہر بار اختر رومال کو اپنی آنکھوں پر دھر لیتا تو گاڑی کے ہچکولوں کے باوجود احساس ہوتا کہ وہ نو نمبر کمرے میں موجود ہے ابھی دروازہ کھول کر ایک چھوٹی سی لڑکی داخل ہو گی اور کہے گی "معاف کیجئے مجھے انیس نمبر میں جانا ہے۔"

لیکن اس بار وہ عادی فلرٹ کی طرح نہیں کہے گا "کاش آپ یہ غلطی بار بار کریں۔"

آج اس کی ساری شوخی، ساری حاضر جوابی ہولے ہولے غائب ہو رہی تھی اس کے ہم سفر نے دو ایک بار اس سے گفتگو کرنے کی کوشش بھی کی لیکن وہ طبیعت



کی خرابی کا بہانہ کر کے صبح سے ہی لیٹ گیا۔ سارے رسالے سارے اخبار فضول ثابت ہوئے۔ جب وہ اخبار کھولتا تو حروف گڈمڈ ہو جاتے اور کراچی سٹیشن پر کھڑی سفید ساڑھی پہنے ایک تنہا لڑکی اس کی نظروں کے سامنے آ جاتی۔ اس لڑکی کی آنکھوں سے آنسو یوں گر رہے تھے جیسے کھڑکی پر مسلسل بارش برس رہی ہو۔ لیکن اس لڑکی کو اس برساتی نالے کا علم نہ تھا۔ وہ تو لوگوں کو علیحدہ کرتی، ہولے ہولے بھاگتی چلتی سٹیشن پر گاڑی کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اور جب گاڑی نے اس کی رفتار سے بے نیاز ہو کر تیزی پکڑ لی۔ تو وہ پلیٹ فارم سے جم کر رہ گئی۔ ایک ہاتھ الوداع کے لئے اٹھا اور پھر اس کے جسم کے ساتھ یوں لگ گیا جیسے الوداعی سلام کو بے سود سمجھ کر کچھ سوچنے بیٹھ گیا ہو۔

ہر بار اختر اس تصویر کو اپنے ذہن سے محو کرتا ہوا کہتا۔ بھلا مجھے ہو کیا گیا ہے۔ معمولی سی بات ہے۔ چھٹیوں کا ماحول تھا۔ کراچی شہر، ہوٹل کی زندگی۔۔ ۔۔ مجھے ایک لڑکی اچھی لگی۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ اور گلاب کی خوشبو نے جیب میں سے اٹھ کر کہا صرف اچھی لگی؛ صرف اچھی؟ اور وہ سوچنے لگتا۔ آنا بھی تو فریتوا نیتو نیو کو بھول چکی ہے کیا مجھے سٹیشن پر کھڑی ہوئی صوفیہ نہ بھول جائے گی۔ کیا میں اس خوش قسمتی کی توقع مستقبل سے نہیں رکھ سکتا؟

گاڑی چھوٹے سٹیشن چھوڑتی کھٹا کھٹ بھاگتی چلی جا رہی تھی۔

اور وہ گہری شام کو باہر کھلی جگہوں پر اترتے دیکھ کر سوچ رہا تھا۔ سارا سنہرا مستقبل لاہور میں ہے دو چار سال میں چچا بزنس سے ریٹائر ہو کر گھر بیٹھ جائیں گے۔ پھر پریس، کتاب گھر دکان، دفتر سب کچھ اس کا ہو گا۔ وہ اور خالدہ آج بھی گلبرگ میں رہتے ہیں اور کل بھی رہیں گے۔ نہ کوئی تبدیلی آئے گی نہ کوئی مشکل درپیش ہو گی۔ بس اس کی توند بڑھ جائے گی۔ اور خالدہ اپنے بالوں کو مہندی اور ہائیڈروجن کے ساتھ رنگنے لگے گی۔ خالدہ سے شادی اتنی عام ہو گی جیسے انسان سانس لیتا ہے کھانا

کھاتا ہے سو رہتا ہے لیکن اُٹھنے پر پھر اس کی سانس چلتی رہتی ہے۔ بس چلتی ہی رہتی ہے اور اس کا احساس کبھی ہو نہیں پاتا۔

چچا نے اس کی زندگی سنواری تھی، اور خالدہ کو مدِ نظر رکھ کر سنواری تھی۔ اب وہ خالدہ کا سہارا لے کر اپنا مستقبل سنوارنے چلا تھا۔ اختر کو پیسے کی قدر و قیمت کا علم تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ روپے کے بغیر زندگی کتنی مشکل ہو سکتی ہے۔ اسی لئے وہ کراچی سے یہاں آپہنچا۔ ورنہ۔۔ ۔ ورنہ سٹیشن پر کھڑی صوفیہ! لوگوں سے بے نیاز آنسو بہاتی صوفیہ!۔۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔۔

اس خیال کے آتے ہی اختر کی آنکھوں میں محبت کی ساری تازہ چبھن آ گئی۔ اس نے آہستہ سے اپنا رومال آنکھوں پر رکھ لیا۔

اس کا ہم سفر رات کا کھانا کھا کر آرام سے سو گیا تھا۔ کمپارٹمنٹ میں صرف غسل خانے والی بتی کی تھوڑی سی روشنی باقی تھی۔ اور گاڑی آڑے ترچھے روشنیوں کے قتلے سیاہ زمین پر پھینکتی بھاگی چلی جا رہی تھی۔

اس نے سگریٹ کا کش لگایا اور سوچا۔ آج سے کتنے ہی سال بعد کسی روز میں خالدہ سے صوفیہ کا ذکر کروں گا۔ کسی سردیوں کی شام کو جب آتشدان کے قریب ہماری بچی کھیلتی کھیلتی اونگھ جائے گی اور خالدہ کے ہاتھ سے اس کا اون کا گولا گر کر دور قالین پر جا گرے گا۔ تو میں صوفیہ کا ذکر کروں گا۔ بالکل جیسے پھول کو بھنورا چوم جاتا ہے۔ اس عشق کا بیان ہو گا آٹھویں جماعت کی ایک لڑکی اپنی استانی کی محبت میں عمر بھر کے لئے مبتلا ہو جائے اور پھر۔۔ ۔۔ ۔۔کسی جواں سال لڑکے کا بوسہ اسے استانی کی ساری یاد بھلا دے۔ اس وقت صوفیہ کی بخشی ہوئی ساری تپش، ساری الجھن ساری کسک ایک مسکراہٹ کی نذر ہو جائے گی اور بس۔ لیکن اگر میں خالدہ کو تب بھی صوفیہ کے متعلق کچھ نہ بتاؤں تو؟ تو بھلا خالدہ کو کیونکر علم ہو سکے گا کہ ایک بار اس کا شوہر موت کی دہلیز کو چوم کر واپس لوٹا تھا؟ کیا خالدہ سمجھ سکے گی



کہ اس کی خاطر، اس کی دولت کی خاطر، زندگی کی آسائش کی خاطر اختر کراچی سٹیشن پر کیا چھوڑ آیا تھا؟

گاڑی بین کرتی، اجاڑنے کا تقاضا کرتی بھاگی جا رہی تھی۔

اس کا ہم سفر خراٹے بھر رہا تھا۔

اور اس کی نظروں میں آتا قالین پر اوندھی لیٹی تھی اس کے سکرٹ کی رنگین لائنیں پنڈلیوں سے ادھر اُدھر پھیلی تھیں۔ اور وہ نہ جانے کہاں پہنچ چکی تھی۔ پیانوں کے سُروں پر ایک نغمہ رواں دواں تھا۔ سیاہ چوٹی کے سرے پر ایک تتلی سفید پھول چھپا بیٹھا تھا۔ گیت کی ہر تان اُٹھتی اور کمرے میں اندھی ابابیل کی طرح چکر لگا کر بالآخر اسی کے لبوں سے چمٹ جاتی۔ نیند سے بوجھل آنکھیں مُند گئیں اور سر تکیے پر ڈھلک گیا۔

ہولے ہولے اُسے محسوس ہونے لگا اس کی کشتی کسی لمبے دریا پر بہہ نکلی ہے کشتی کے بادبان میں ہوا کے جھونکے بھر رہے ہیں۔ ڈوبنے والے چاندنی ساری کرنیں دریا کی سطح نے چاٹ لی ہیں۔ اور اب اس کی لہر لہر میں پارہ دمک رہا ہے۔ گھاٹ پر دور وہ سفید ساڑھی پہنے ہاتھ میں دیا لئے کھڑی ہے جب پتوار پانی کی سطح کو چھوتا ہے تو گھاٹ کی اس جانب سے ایک ہلکی سی صدا آتی ہے جیسے کوئی گیت کے چپو باندھ کر اسے لینے آ رہا ہو۔ چاندنی کا سارا پارہ دریا نے پی لیا ہے۔ کشتی کے بادبان میں ہوا بس گئی ہے اور پتوار لٹک کر ڈوبتا ہے اُبھرتا ہے اور لحظہ بہ لحظہ وہ دیا۔ وہ سفید ساڑھی قریب آ رہی ہے۔

وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اس کی گاڑی سٹیشن پر رکی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی کوئی گرد اور سبز ڈبوں والی کوئی دوسری ٹرین بھی کھڑی تھی۔ سامنے والے ڈبے میں اونگھتے ہوئے مسافر کھڑکیوں میں سے نظر آ رہے تھے۔ اختر کا دل کنپٹیوں کے قریب بج رہا تھا۔ اس نے فرسٹ کلاس کی کھڑکی کھولی۔ سامنے گارڈ سبز بتی لئے کھڑا تھا۔ کونسا

"سٹیشن ہے جی۔" اس نے پوچھا۔

کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔

"اور یہ دوسری کون سی گاڑی رکی ہے۔"

"سر تیز گام کراچی جا رہی ہے یہاں اس کا کراس ہے ہماری گاڑی سے گارڈ نے کہا۔"

جلدی سے وہ ڈریسنگ گاؤن پہنے باہر نکل آیا۔ قلی کے ساتھ سامان بندھوا کر جلدی جلدی سیڑھیاں پھلانگتا وہ دوسری جانب پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ رات کی خاموشی کو اس جانب ابھی تک خوانچے والوں کا شور برباد کر رہا تھا۔ وہ تیزی سے ایک انٹر کے ڈبے میں بیٹھ گیا اس کا دل حلق کے قریب ہی کہیں قلابازیاں لگا رہا تھا۔ سامان اندر لگانے والے قلی کو پیسے ادا کر کے اس نے کہا: "ذرا ٹکٹ چیکر کو بھیج دینا مجھے کراچی کا ٹکٹ خریدنا ہے۔"

گاڑی روشنی کے آڑے ترچھے فیتے پھینکتی کراچی کی طرف جانے لگی۔ اس کے لبوں پر گیت تھے، نغمے تھے۔ بہتی ندیوں کے گیت، بادبانوں کے گیت، شونار دیس کے گیت۔

اختر کھڑکی کے ساتھ سر لگا کر بیٹھا تھا۔ اس کی جیب میں کل تین سو روپے تھے لیکن وہ ڈرتے ڈرتے اپنے جی کو سمجھا رہا تھا۔ "آخر جو بلیک مارکیٹ کا روپیہ نہیں سمیٹتے وہ بھی تو زندہ رہتے ہیں۔"

گاڑی گاتے جا رہی تھی۔

میری کشتی ٹوٹ چکی ہے بھلا اس ٹوٹی کشتی کو کھے کر تو کہاں لے جائے گی۔

اے میری جان۔ کیا تو اپنے سنہری دیس میں اس چاہنے والے کو لے جانے کا ارادہ رکھتی ہے۔

گیت کے بول لوری بن چکے تھے۔ ہر گام پہ کراچی نزدیک آ رہا تھا۔

اور وہ تیز گام کی سبز کھڑکی سے سر لگائے شونار دیس میں پہنچ چکا تھا۔